علی امام نقوی

کہی اَن کہی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

علی امام نقوی

کہی اَن کہی

(افسانے)

کہی اَن کہی

(افسانے)

علی امام نقوی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

54-C/5، جے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

©محمد جواد ضیا حیدر (ہندوستان)، اجمل کمال (پاکستان)

نام کتاب : **کہی اَن کہی** (افسانے)

مصنف : علی امام نقوی

پتہ : 54/103، نوح اپارٹمنٹ، نیا نگر، میرا روڈ، تھانے۔ ۴۰۱۱۰۷ (ممبئی)
(Mob: 08879450630, 09769701770)

تعداد : ۵۰۰

ناشر : انیس امروہوی
○ **تخلیق کار پبلشرز**
54-C/5، جے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

سرِ ورق : علی امام عابدی

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

مطبع : کلاسِک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔ پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔ جے۔ اسپتال، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۸
- ہورائزن ڈسٹری بیوٹرس، گورا چاند روڈ، اِنٹالی، کولکاتہ۔ ۷۰۰۰۱۴ (مغربی بنگال)

T.P.: 0250 **ISBN-978-93-80182-66-7**
KAHI ANKAHI *(Short Stories)* **2012**
By ALI IMAM NAQVI **₹ 160.00**
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
54-C/5, J - EXTENSION, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail: qissey@rediffmail.com

○

متحرک اظہاریۂ انفاق کے عملی مفسروں

عالی جناب عبداللہ نوروزی

(سابق قونصل جنرل، اسلامی جمہوریہ ایران، ممبئی)

برادر عزیز سید محمد اشرف

اور

نفیس عالم نقوی

کے نام

بہ ایں احساس

مالک تو ہے خدا ہی مگر وقتِ بے کسی
بندے بھی کام آتے ہیں اکثر خدا کے بعد

ــ حضرتِ آوارہ

○○

''اُس قرأت میں کوئی خوبی نہیں جس میں غور وفکر نہ ہو۔''

(حضرت علی علیہ السلام)

تو کہ فلس ماہی حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بنشیں چہ طوطی و دمبدم بشنو خروش نہنگ را

قرۃالعین طاہرہ

ذرّات

۱۔ آپ رُکے کیوں نہیں ۹

۲۔ نقش ۱۹

۳۔ پاسا ۲۹

۴۔ تشخیص ۴۵

۵۔ کہی اَن کہی ۵۷

۶۔ کوند ۶۵

۷۔ ہونی اَن ہونی ۷۵

۸۔ سچ مچ ۸۷

۹۔ موسم ۱۰۱

۱۰۔ رہپٹ ——— ۱۰۹
۱۱۔ اُفوہ ——— ۱۱۹
۱۲۔ پٹ بیجنا ——— ۱۲۷
۱۳۔ انکبولا ——— ۱۴۱
۱۴۔ جگاڑ ——— ۱۴۹

○○

آپ رُکے کیوں نہیں

"کچھ بھی تو نہیں بدلا، سب کچھ ویسا ہی ہے۔ پہلے بھی سڑک یہیں تک تھی۔ سواریاں ٹم ٹم سے یہیں اُترتی تھیں اور اپنا اپنا سامان اُٹھائے لوگ گھروں کی طرف چل دیا کرتے تھے۔

آٹو رکشہ کا کرایہ ادا کرتے ہوئے اظہار نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا تھا یا کراچی سے ساتھ آئے مختار سے؟ دونوں کیا تینوں ہی نہ سمجھے۔ کلکتہ سے

بردوان اور وہاں سے اودھم پورہ تک وہ بس میں آئے اور وہاں آٹو رکشہ پہ نظر پڑنے کے بعد پہلے تو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر تینوں ہی آٹو رکشہ کو دیکھنے لگے تھے جس میں کئی سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سواریوں میں ان کے ہم عمر دو تین ہی تھے جنہوں نے ان تینوں کو پہلے تو غور سے دیکھا پھر اپنے ذہنوں پر زور دیا۔ کسی کو کچھ یاد نہ آیا تو ان میں سے ایک نے ان سے پوچھنا ہی مناسب جانا اور جب اس نے یہ جانا کہ سبھی کراچی پاکستان سے آئے ہیں تو اس نے دوسرا سوال کیا:

''کس کے گھر جائیں گے؟

سوال نہیں کیا گیا۔ ان تینوں نے محسوس کیا سوال کرنے والے نے انہیں صحرا میں کھڑا کر دیا ہے۔ چاروں طرف ریت ہی ریت ہے، منزل ہے نہ ہی اس کے آثار۔ پل بھر کے لیے وہ لرز کر رہ گئے۔ لیکن فوراً حافظے نے انہیں سنبھالا۔ انہیں یاد آیا، ایمبیسی میں ویزا فارم کی خانہ پُری کرتے ہوئے یہ سوال کسی اور رُوپ میں اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ گھنٹہ بھر بعد جب سفارت خانے میں افسر کے سوالوں کے جوابات دے رہے تھے تب بھی یہی سوال کسی اور شکل میں اُن کے سامنے موجود تھا:

''بلوندر پال سے ملنے آپ کیوں جانا چاہتے ہیں اور یہ بھی بتائیں، بلوندر صاحب آپ کے کون ہیں؟

بلوندر اُن کا کوئی نہ تھا۔ اُنہوں نے بے چارگی سے افسر کو دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا:

''اس گاؤں میں آپ تینوں کا کوئی بھی سگا سمبندھی نہیں ہے۔ آپ میں سے ایک بھی نہیں بتا پا رہا ہے کہ بلوندر آپ کے کون ہیں؟ اور پھر بھی آپ بردوان کے اس گاؤں میں جانے کی خاطر کراچی سے اسلام آباد ویزا لینے آئے ہیں۔

''دیکھئے صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہم وہاں بلوندر سے ملنے نہیں جا رہے ہیں۔ وہ ہے بھی یا نہیں یہ تو ہم بھی نہیں جانتے۔ ہمیں اس کا نام بھی اس وجہ سے یاد رہ گیا کہ جب ہم وہاں سے چلے تھے وہ ہمیں چھوڑنے کلکتے تک آیا تھا۔

ویزا افسر کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تو بڑے ہی معنی خیز انداز میں فارم کے ذیلی حصے پر دستخط کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

''پورے ترپن برسوں کے بعد گاؤں یاد آیا ہے۔

ان تینوں کو اُس کا مسکرانا اچھا لگا، نہ اس کی بات ہی بھلی معلوم دی۔ اظہار اور مظہر کے تو منہ ہی بن کر رہ گئے تھے پر مختار نے بات نبھائی تھی:

''دیکھئے جی! یاد تو بھلا دینے والوں کو کرتے ہیں۔ گاؤں کے جن گھروں میں ہم پیدا ہوئے، جن گلیوں میں کھیلے کودے، اُنہیں کون بھلا پائے گا صاحب۔

''سوری، لیکن میں پھر کہوں گا پورے ترپن سال بعد.....

''نہیں صاحب نہیں۔ یاد تو وہ روز ہی آتا رہا اور زوروں سے یاد آتا رہا ہے۔ لیکن اب تک ہماری مجبوریاں ہمیں روکتی رہیں۔ بچوں کی تعلیم، تربیت، ان کے مستقبل کا خیال..... اب کہیں وقت نے مہلت دی تو ہم نے سوچا کہ اس سے پہلے ہم اِس زمین کا حصہ بن جائیں۔ اُس زمین کو چوم آئیں جس پہ آج بھی ہمارے وجود کا لمس ناچتا ہوگا۔ اور صاحب! خاص بات تو یہ ہے کہ وہیں ہمارے پرکھے آرام کر رہے ہیں۔

''بلوندر کے گھر.....

پلکیں میچ کر ان میں سے دو نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی پھر ٹھنڈا سانس خارج کرتے ہوئے تھوڑے سے فاصلے پہ موجود بستی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد سڑک سے ملحق گلی کی طرف بڑھ گئے۔

''رکشہ سے اُترنے کے بعد تم نے کچھ کہا تھا؟

''ہاں۔ میں نے کہا تھا..... کچھ بھی تو نہیں بدلا۔

'' کہتے ہوئے خیال نہ آیا، ہم بدل چکے ہیں۔

اظہار نے مختار کی بات پر دھیان دیتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی مظہر کی طرف دیکھا اور سر جھکانے کے بعد اسے اثبات میں جنبش دی۔ پانچ منٹ بعد گاؤں کے کھڑنجوں پہ چلتے ہوئے ان تینوں کے دلوں میں مسرت کدکڑیاں بھر رہی تھی۔ دائیں، بائیں کچے مکانوں کے اندر سے آتی مٹی کی بساندان کے نتھنوں میں اُتری تو دلوں میں کدکڑی بھرتی خوشی قلانچیں لگانے لگی۔ ایک آدھ دروازے پہ کھڑی عورت نے انجانے چہرے دیکھے تو دو قدم پیچھے ہٹی اور کواڑوں کے پٹ بھڑ گئے۔ کچھ پل بعد کھلے تو گھروں میں سے چھوٹے بچے باہر نکلے اور ان کے پیچھے ہو لئے۔ اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے وہ بڑھتے رہے۔ دو ایک گلیوں سے گزرنے کے بعد اُنہیں محسوس ہوا بچوں کے ساتھ ساتھ کچھ نوجوان بھی ہیں۔ انہوں نے رُک کر ان سبھی کو دیکھا۔ ایک نوجوان کو اشارے سے بلانے کے بعد اس سے بلوندر کے متعلق معلوم کیا تو وہ ان سے دو قدم آگے چلنے لگا اور کچھ ہی دیر بعد لکھوری اینٹوں والے مکان کے دروازے پہ کھڑا وہ کسی کو آواز دے رہا تھا۔ دوسری ہی آواز پر اسی کی عمر کا ایک لڑکا دروازے پر پہنچا تو اس نے اس سے کہا:

''یہ..... تیرے دادا کو پوچھ رہے ہیں۔

مکان کے اندر سے کسی کی گونجتی ہوئی آواز نے معلوم کیا کہ کون ہے اور جواب میں نوجوان نے سوال کرنے والے کو دروازے پر بلایا تو انہیں اطمینان ہوا۔ دوسرے ہی پل ایک تنومند شخص ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''ہمیں بلوندر سے ملنا ہے..... آپ.....

''کون ہے؟

مکان کے اندر سے ایک اور آواز انہوں نے سنی تو تینوں کے چہرے کھل

اُٹھے۔ تنومند شخص ان کے مطمئن چہروں کو دیکھ کر اُلٹے پیروں لوٹا۔ اس دوران مکان کے سامنے کچھ اور لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ہر آنکھ میں اشتیاق ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ بچے پہلو بدل رہے تھے اور وہ تینوں بھی کبھی ان سب کو دیکھتے کبھی آس پاس کے مکانوں پر نظر ڈالتے۔

''کون ہیں؟

ساٹھ پینسٹھ برس کا ایک بوڑھا، تنومند کے شانے پر ہاتھ رکھے دروازے پہ کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ مختار، اظہار اور مظہر نے غور سے اُسے دیکھا۔ تینوں کے دل زور زور سے دھڑکے۔ مختار کا دل کچھ زیادہ ہی زور سے دھڑکا تو اس نے بوڑھے سے کہا:

''پہچانا نہیں بلّو؟

''مکی با!

''ہاں بلّو۔ تمہارا مکی با۔

اور پھر تو سب ہی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ بلوندر نے آگے بڑھ کر مختار کے ہاتھ پکڑنے کے بعد انہیں چوما اور مختار نے ہتھیلیوں کی پشت پر نمی محسوس کرتے ہی جان لیا کہ بلوندر رو رہا ہے۔

''اپنے کو سنبھالو بلّو۔

''رُلاتے ہوئے گئے تھے مکّی با۔ اب آئے ہو تو رونے کو منع کر رہے ہو۔ جوگا! ان کے چرن چھوؤ، یوگی سے بھی کہو ان کے چرن چھوئے.....یہ.....یہ

اظہار اور مظہر پہ نگاہ پڑتے ہی بلوندر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے مختار سے معلوم کرنے کے ارادے سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے کہا:

''یہ اجوّ ہے اور یہ ان کا چھوٹا بھائی مجوّ۔ دونوں ذکی چچا کے پوت ہیں۔

بلوندر نے مختار کو چھوڑ ان دونوں کو ساتھ ہی گلے لگایا۔ تنومند جوگا اور

دروازے پہ پہلے آنے والے جوان نے مختار کے پیر چھوئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد گاؤں کے کئی بزرگ اور جوان بلوندر کے صحن میں مونڈھوں، چارپائیوں اور پاس پڑوس سے منگوائے گئے اسٹولز پر بیٹھے تھے۔ نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد ان سبھی کو گھیرے کھڑی تھی۔ بلوندر کے برابر ہی مونڈھے پہ اس کی بیوی بھی بیٹھی باتیں سن رہی تھی، اس کے پیچھے جوگا کی بیوی اور دو لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ ایک جوان ہو چکی تھی اور دوسری پہ جوانی بس آیا ہی چاہتی تھی۔ مونڈھوں کے بیچ میز کے اوپر چائے کی پیالیاں اور دو طشتریوں میں بسکٹ اور دال موٹھ موجود تھے۔ تمام ہی لوگوں کے چہروں سے استعجاب بولنے کو تھا۔ نوجوانوں کی آنکھوں میں سوال مچل رہے تھے مگر کوئی بھی کچھ نہ پوچھ پا رہا تھا کیونکہ بلوندر سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا:

''اب تو بکوبا کے بچے بھی جوان ہوں گے۔ اس نے مختار کے چھوٹے بھائی کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔

''ہاں بلّو! وہ تو اتنے بڑے ہو گئے کہ اب تو بختیار، اس کی بیوی اور ہم بھی چھوٹے ہو چکے ہیں۔ دونوں ہی کینڈا میں ہیں۔ ایک ڈاکٹر ہے۔ دوسرا بیرسٹری کر رہا ہے۔

''اور آپ کے والے؟..... بلوندر نے اظہار سے پوچھا تو اس نے طشتری میں سے بسکٹ اُٹھاتے ہوئے کہا:

''میرا تو، ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر ہے لیکن دوا دارو والا نہیں۔

''اور بی بی صاحبہ کیسی ہیں؟ بلوندر نے مختار کی والدہ کے بارے میں پوچھا تو مختار کے بجائے اظہار نے اسے بتایا کہ وہ اب نہیں رہیں۔ بلوندر نے اپنے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ بہت ہی یاد کرتی تھی انہیں..... بڑی دیالو، بڑی محبت کرنے والی تھیں بی بی۔ پربھو سورگ میں انہیں پل پل آرام دیتا ہوگا۔

ان تینوں کے چائے کی چسکیاں لیتے، بسکٹ کھاتے منہ گلوگیر لہجے کو سن کر لحظہ بھر کو رُک گئے۔ اظہار غور سے اس خاتون کو دیکھ رہا تھا لیکن مظہر کی آنکھوں میں نظر آنے والی بے یقینی مختار نے صاف صاف دیکھ لی۔ چارپائی پہ بیٹھے ان ہی کے ہم سِن نے بلوندر کو مخاطب کرنے کے بعد اسے تینوں کی تھکن کا احساس دلایا اور پلنگ سے اُٹھتے ہوئے حاضرین سے مخاطب ہونے کے بعد پوچھا کہ آج کس کی باری ہے؟ بلوندر کے پوتے نے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ ان تینوں کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ کس نے کیا دریافت کیا اور جواب میں اشارہ اسے مطمئن بھی کر سکا یا نہیں؟ لیکن انہوں نے دیکھا، سوال کرنے والا ان سے رُخصت کی اجازت کا طلب گار ہے اور یہ یقین بھی دلا رہا ہے کہ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر اُسے رُخصت کیا۔ اس کے پیچھے ہی خاصے لوگ نکل گئے۔ بلوندر کی بیوی نے مڑ کر پیچھے کھڑی بہو اور لڑکیوں سے کچھ کہا۔

باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جوگا، یوگی اور اس کی بہنیں کئی بار چائے لا چکے تھے۔ بسکٹ اور دال موٹھ کی پرچیں اُٹھائی جا چکی تھیں۔ اظہار اور مظہر بلوندر سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن چونکہ بات چیت کے ڈانڈے ان سبھی سے ملے ہوئے تھے جو آگے پیچھے مختلف ٹکڑیوں میں پاکستان گئے، اس لیے انہوں نے تامّل سے کام لینے کو ہی بہتر جانا۔ البتہ دونوں بھائی اس پہ زیادہ خوش ہو رہے تھے کہ پچاس برسوں کے بعد بھی انہیں یاد کرنے والی ہستی ان کے سامنے بیٹھی ہے۔ باتیں ہوتی ہی رہیں۔ صحن میں موجود نیم کے پیڑ کا سایہ مشرقی مکان کی دیوار پہ پڑا تو سب سے پہلے مظہر نے پہلو بدلا۔ اس نے اظہار کی طرف جھک کر اس سے کچھ کہا۔ مختار اور بلوندر نے انہیں دیکھا تو بلوندر نے پوتے

کو پکارا۔ اس کے آنے پر اس سے کہا کہ ان دونوں کو مسجد میں لے جائے اور تب تک وہیں رہے جب تک یہ نماز ختم نہ کر لیں۔

''کمال ہے صاحب کمال ہے۔ بچے سے پتہ چلا کہ بستی میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے پر مسجد تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ کون کرتا ہے صاف صفائی؟ کس نے کروائی کلی؟

مظہر نے بلوندر سے پوچھا تو جواب میں اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور جتنی بھی ہوا پھیپھڑوں میں بھر سکا، بھرنے کے بعد اسے منہ سے خارج کر گیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنے ذہن پر زور دے کر اس کی اس حرکت کو عنوان دینے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ناکامی کے بعد ان کی نگاہیں مختار کے چہرے پہ مرکوز ہو گئیں۔ ان کی باتیں بلوندر کی بیوی بھی اندر بیٹھی سن رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے کہنے لگی:

''صاف صفائی ہم کرتے ہیں۔ سال میں دو بار کلی بھی ہم ہی پھیرتے ہیں۔

دونوں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا، پھر مظہر نے کہا:

''عجیب سا محسوس ہوا ہے جان کر۔ وہاں جب یہ خبر ٹی۔وی پہ دیکھی، سنی کہ مسجد دن دہاڑے ڈھا دی گئی تو یقین کریں ہمیں افسوس کم ہوا، پر غصہ زیادہ آیا تھا۔ بس پل بھر کے لیے ہمیں یہ مسجد یاد آئی تھی۔ لیکن اب حیرت ہو رہی ہے۔

''حیرت کیوں بھائی؟ اس لیے کہ ہم مسلمان نہیں۔ نہیں ہیں تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ آدمی اپنے گھر کی صاف صفائی کرتا ہے نا۔ وہ تو ہمارے پالن ہار کا گھر ہے۔ آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہم سبھی نے مل بیٹھ کر طے کیا تھا کہ روز صبح نہا دھو کر ہم میں سے دو چار مسجد صاف کرنے پہنچیں گے۔ ہر گرووار کی شام کو کچھ عورتیں وہیں موم بتی جلاتی ہیں جہاں بی بی جلایا کرتی

تھیں۔ ہم سب نے یہ بھی طے کیا کہ روز صبح، دوپہر اور شام کو باری باری وہاں اذان دی جائے گی۔

تینوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، دہانے وا تھے اور انہیں جو کچھ بھی یاد آ رہا تھا، وہ ان کی نظریں جھکانے کا باعث تھا۔ لیکن بلوندر کی بیوی انہیں اس کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی:

''ہمارا جوگا، اس کا پوت، روز شام جھٹپٹا ہوتے ہی مسجد میں جا کر چراغ جلاتے ہیں۔ جس کا وار ہو وہ اذان دیتا ہے۔ یہ دونوں اور کچھ دوسرے، تمہاری طرح کانوں پہ ہاتھ رکھ کر اللہ اکبر کہتے ہیں۔ پھر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر جھک جاتے ہیں اور پھر اپنے سیس دھرتی پر ٹیکتے ہیں..... یہ بتا رہے تھے۔ مسجد ان کے جنم سے پہلی مکّی با کے باپ نے بنائی تھی۔

''باپ نہیں دادا نے بنوائی تھی۔

بلوندر نے تصحیح کی تو ان کی نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ تینوں کی آنکھوں میں پتلیوں کو متحرک دیکھ کر بلوندر نے ان سے کہا:

''پورے گاؤں میں یہی ایک مسجد ہے۔ اتر کی اور دھرم تلّہ میں ایک مندر بھی ہے۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد ہم نے آپس میں فیصلہ کیا ہم اسے ویران ہونے نہ دیں گے۔ نماز ہو یا پوجا..... ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسری بستی سے کچھ لوگ ہمیں سمجھانے آئے تھے مگر ہم نے ان کی ایک نہ سنی۔ اپنا گھر تو مکّی با مجھے دے گئے تھے۔ چلنے سے پہلے میں نے مکّی با سے کہا بھی تھا: دنگے تو آس پاس ہو رہے ہیں، آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ پاکستان نہ جائیں۔ مگر میری کسی نے بھی نہ سنی، سب کے سب پہلے کلکتے گئے، پھر ڈھاکہ۔ کراچی کب گئے، ہمیں معلوم ہی نہ ہوا۔ آپ لوگ بُرا نہ مانیں تو آج میں آپ سب سے پوچھوں گا: ہم تو آپ کو جانے ہی نہیں دے رہے تھے، آپ رُکے کیوں نہیں؟

بلوندر کا سوال اُن سے جواب طلب کر رہا تھا اور اُن تینوں کے سر آہستہ آہستہ جھکتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ٹھوڑیاں سینوں سے لگتیں مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ سب ہی نے دیکھا، مکان کے گھیر میں اندھیرا دبے پاؤں اُتر رہا ہے اور اُن کے کانوں میں اذان کے ساتھ بلوندر کا سوال بھی اُترتا جا رہا ہے۔

○○

نقش

میں اعتراف کرتا ہوں، ابھی تک نہ جان سکا ان دونوں میں مریض کون ہے؟ ایلوپیتھی فزیشیئن نے حسب روایت دسیوں رپورٹس کی فائل بنائی پھر بھی نہ جان پائے ان میں بیمار کون ہے؟ کچھ رپورٹس سے بیٹے، بہو اور ماں کو اس کا یقین ہو گیا کہ بیٹے میں عیب ہے نہ بہو میں خامی۔ دو ایک ٹیسٹ میں نے بھی کروائے اور پھر اعتراف کر رہا ہوں یہ پیچیدہ کیس ہے۔ اسی لیے انہیں آپ کے

سپرد کر رہا ہوں۔

''ہوں ....ں.....ں

ہنکاری بھرتے ہوئے میں نے محسوس کیا نون کی گہرائی زیادہ ہے، میرے سامنے تین نفر تھے: ایک سن رسیدہ خاتون، دوسری جوان اور ان کے درمیان خوبرو جوان۔ سن رسیدہ عورت نے میرے سامنے فائل بڑھاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔ صرف دو جملے اس معمر خاتون نے کہے اور مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا:

''اس فائل میں ان کی میڈیکل رپورٹس موجود ہیں۔

''اس میں جو بھی ہے ڈاکٹر ڈمری نے اپنے خط میں لکھ دیا ہے۔ یوں بھی مجھے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی۔

تینوں ہی حیرت سے مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں نے اپنا پیڈ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے اس پر تینوں سے موبائل نمبر لکھنے کی درخواست کی تو ان کی حیرتوں میں اضافہ ہوگیا۔ پیڈ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے لڑکے نے غور سے مجھے اور میں نے بڑے ہی غور سے تینوں کو دیکھا۔ معمر عورت نے اس اثنا میں، جب لڑکا نمبر لکھ رہا تھا، کئی مرتبہ پہلو بدلا تھا۔ میں نے لڑکے کی بے دلی اس کے نمبر لکھنے اور بار بار کنکھیوں سے مجھے دیکھنے سے محسوس کی۔ بہو کا چہرہ سکون کا شاہد ضرور تھا مگر اس کی آنکھوں میں موجود تلاطم مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

''میں نے لینڈ لائن نمبر بھی لکھ دیا ہے لیکن اس نمبر پر صرف شام کے بعد ہی گفتگو ممکن ہے۔

''ہو....ں.....ں....ں

''میں.....خود ان نمبروں پر رابطہ قائم کروں گا۔ مناسب جانوں گا تو اکٹھے

یا الگ الگ زحمت دوں گا اور..... یہ بھی ممکن ہے خود بھی آپ تک پہنچوں۔

''مگر.....

معمر عورت نے پہلو بدلتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر وہ تھوک نگل کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں سوال تھے اور جب میں نے ان سے جانے کے لیے کہا تو دیکھا تینوں کی آنکھوں میں بے چینی ڈیرا ڈال چکی تھی۔

''آپ تینوں جاسکتے ہیں۔

بڑی عجیب سی کیفیت میں تینوں نے مجھ سے ہاتھ ملائے۔ مجھے احساس ہے تینوں میرے بارے میں اچھا تاثر لیے بنا ہی جا رہے ہیں۔ انہیں اس رقم کا ملال بھی ہوگا جو فیس کے نام پر وہ پہلے ہی ادا کر چکے تھے۔ ممکن ہے انہیں رقم کے ڈوبنے کا بھی یقین ہو گیا ہو۔

—O—

دوسرے روز شام ہوتے ہی بلا اطلاع ان کے فلیٹ پر پہنچا تو ان کے مبہوت ہونے کا مجھے یقین تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنے استقبال نہ کرنے کی ان سے شکایت کی تو سب ہی خفیف سے ہو کر رہ گئے۔ ساس کے اشارے پر بہو نے رسمیات کا سہارا لیتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ سجانے کے بعد منہ کھولنا چاہا تو میں نے خود ہی اس سے ٹھنڈا پانی طلب کیا۔

''صرف پانی؟

معمر خاتون کے لہجے میں موجود استعجاب پر میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

''آپ کو حیرت کیوں ہے؟

''اس سے تو ہم بچ ہی نہیں سکتے ڈاکٹر صاحب! دیکھیے نا: پہلے فیملی ڈاکٹر، پھر ہومیوپیتھی اسپیشلسٹ اور پھر آپ۔ زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار آپ سے واسطہ پڑا ہے..... آپ کا رویہ..... ہمیں تو عجیب ہی لگا..... اسی پر باتیں کرتے ہوئے ہم لوٹے تھے.... اوہ..... معاف کیجیے۔ آیئے تشریف لے آئیں۔

میں نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے صوفے کی طرف قدم بڑھائے اور اپنا بیگ ایک طرف رکھنے کے بعد اس خاتون کی طرف متوجہ ہوا۔

''بُرا نہ مانیں تو میں یہ جاننا چاہوں گی، آپ سب اپنے مریضوں سے اسی طرح پیش آتے ہیں؟

''اوروں کے متعلق کس طرح کچھ کہہ سکتا ہوں؟ اپنے بارے میں یقین سے کہوں گا میرا طریقہ وہی ہے جس سے آپ دوچار ہوئیں..... لیکن یہ اوروں کے حق میں مفید نہیں ہوسکتا۔

''بڑی..... بڑی گڑبڑ ہے صاحب!

''اسی کے سبب تو آپ تینوں مجھ تک پہنچے اور اسی کی خاطر میں آپ سے مخاطب ہوں۔

بہو ٹھنڈے پانی کے بجائے جوس کے گلاس لے آئی۔ اس سے گلاس لیتے ہوئے بیٹے نے بھی اپنی حیرت کا اظہار کیا تو میں نے جواباً کہا:

''ہاں بھئی! مگر اسے کلیہ نہ سمجھئے..... یہ تو مریض اور اس کے عارضے پہ منحصر ہے۔

''ہم تینوں میں..... مریض تو ہم دونوں ہیں۔ رپورٹس اس کی گواہ ہیں جنہیں دیکھنا بھی آپ نے مناسب نہ سمجھا۔

''کل ڈسپینسری ہی میں کہہ چکا ہوں مسٹر! ڈمری نے اپنے خط میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔

''پھر.....آپ کا.....طریقہ کیا ہے؟ معمر خاتون نے پوچھا۔

''عام طور پر سوالات پوچھتا ہوں۔

''کس طرح کے ہوتے ہیں سوالات؟

''نوعیتیں بدلتی رہتی ہیں.....کبھی بات چیت ہی سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

''ہم سے سوالات ہوئے نہ باتیں!

''ہم اِس وقت کیا کر رہے ہیں؟

''اس کا تعلق تو.....ایک ماں کے اس ارمان سے ہے جو پانچ چھ برسوں سے اس کے لیے عذاب بنا ہوا ہے۔

سن رسیدہ عورت کے لہجے کی درشتگی محسوس کرتے ہوئے میں نے تینوں کے چہرے دیکھے۔ بہو کے چہرے پر بیزاری کے سائے تھے اور بیٹے کا چہرہ اذیت میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا، پل بھر بعد اسے دانتوں کی گرفت سے آزاد کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا:

''آپ ممی اور ان سے انٹرویو کریں، میں.....حاضر ہوتا ہوں۔

''بہتر ہوگا ٹھنڈے پانی کا ایک ایک گلاس پی لیا جائے۔

احتراماً اک ذرا خمیدہ ہو کر بہو کچن کی طرف بڑھ گئی اور بیٹا اپنے بیڈروم کی طرف چل دیا۔ میں نے غور سے جہاں دیدہ عورت کو دیکھتے ہوئے ان سے پوچھا:

''آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

''ایم۔ایس۔سی، پی۔ایچ۔ڈی۔

''کس میدان میں؟

''میڈیکل بائیوکیمسٹری۔

''ہوں....ں.....ں۔

''آپ ہنکاری بہت لیتے ہیں ڈاکٹر صاحب، میں جاننا چاہتی ہوں فرائڈ اس بارے میں کیا کہہ گئے؟

''ان سے پہلے بھی جانداروں نے جماہی لی ہے، ہنکاری بھری ہے۔

''کیا کہنا چاہتے ہیں؟

''مجھے جو کہنا تھا عرض کر چکا ہوں، بس اس قدر اور عرض کرنا ہے: ہمارے بدن میں اک پورا جہان ہے۔ ان کی پیچیدگیاں آئے دن نت نئے ماہرین کو جنم دے رہی ہیں۔ انسان تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے سب کچھ جان لیا ہے۔ جبکہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ آپ نے میڈیکل بائیوکیمسٹری میں سند پائی ہے..... کیا آپ جانتی ہیں اس دُنیا میں جو کچھ بھی موجود ہے، اس کا تعلق جمادات سے ہو، نباتات سے ہو، حیوانات اور انسان، سبھی کو جوڑے کی شکل میں پیدا کیا گیا ہے، خود آپ کا وجود بھی جوڑے کی دین ہے اور آپ کے بیٹے کے تار و پور بھی اس کے مرہون ہیں۔ لیکن معاف کیجیے آپ نے بیٹا..... پیدا نہیں کیا ہے؟

''کیا کہہ رہے ہیں؟

''آپ کی بہو ٹھنڈا پانی لیے کھڑی ہے، اُسے پی لیجیے۔

''کیسے ڈاکٹر ہیں، انتہائی بے ہودگی سے کہہ رہے ہیں، میں نے بیٹا پیدا نہیں کیا۔

''پانی پی لیجیے میڈم! اور..... مان لیجیے اگر آپ اسے جنم دیتیں تو اپنے لختِ جگر پر اس عالم میں تیزابی حملے نہ کرتیں۔ جب یہ ذرا سا تھا اور اپنی بھوک سے مجبور ہو کر بلک بلک کر اپنے ہونے کی گواہی دیا کرتا تھا..... ایلوپیتھی کی تمام رپورٹس بیٹے اور بہو کے حق میں ہیں، ان میں مریض کوئی بھی نہیں ہے..... ابھی ابھی..... میں نے تیزابی یورش اور آپ کے فرزند کے چھوٹے ہونے کی بات کی

تھی..... خود آپ پڑھی لکھی ہیں، مگر سچ تو یہ ہے: بیشتر پڑھے لکھوں کی طرح بس ضرورتاً ہی آپ نے پڑھ لکھ لیا ہے۔ اگر آپ نے واقعتاً علم حاصل کیا ہوتا تو اپنی ذرا سی تکلیف کی وجہ سے ننھے سے وجود پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بھی آپ کو یاد رہتا کہ ابھی صرف مچلنا اور رونا ہی اس کے اختیار میں ہے۔ اس کی زبان بولنے پر قادر نہیں مگر اس کے کانوں کے دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ اور وہیں کہیں آس پاس ہی حافظے کا مسکن بھی ہے۔ جوں جوں یہ پرورش پاتا رہے گا، سنی سنائی اس کی طینت کی تشکیل پہ اثر انداز ہوگی اور یہی آپ کے بیٹے کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کی احتیاط، آپ کا ارمان، اور آپ کی بہو کی ضرورت، یہی تو مسئلہ ہے۔ پھر کہوں گا..... بہو پانی لے آئی ہے اسے پی لیجیے۔ اور اب تھوڑی باتیں ان سے بھی کروں گا۔ مگر آپ کی موجودگی ضروری نہیں۔

''ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گیلری میں چلی جاؤ اور سلائڈنگ بند کر لینا۔

—○—

''مسئلہ دریافت کیا جائے یا آپ خود بیان کرنا مناسب سمجھیں گی؟

ایک لمبی چپ ہمارے درمیان دیوار بنی، میں اُس کو اور وہ اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میرے کھکارنے پر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی:

''مسئلہ ہے صاحب۔

''ہم اسی کو حل کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہیں۔

''آپ نے ممی سے کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اسی کچھ میں سب کچھ ہے۔

''تمہید کے بغیر باتیں شروع ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔

''کیسے کہوں؟

''کھیت دیکھے ہیں؟

''ہم شہر میں پیدا ہوئے۔ گاؤں سے ہمارا کوئی واسطہ ہی نہیں.... مگر صاحب سچ تو یہ ہے کہ ایک اٹوٹ واسطہ ہے۔ ہمیں خوراک وہیں سے ملتی ہے۔ اسی زمین سے۔ زمین..... ہاں زمین.... ڈاکٹر صاحب اِس زمین سے چشمہ اُبلتا ہے مگر اس کی اپنی پیاس تو بادل کے برسنے ہی سے بجھے گی۔

''اس کا مطلب ہے....

''نہیں نہیں.... میں.... کیسے کہوں؟.... کچھ باتیں کہی نہیں، سمجھی جاتی ہیں..... میں تو عرض کر چکی ہوں۔

''یعنی آپ اس پہ راضی ہیں۔

''میں تو عورت ہوں حضور! عورت جو خاوند کی رضا میں راضی ہوتی ہے۔

''اس کا مطلب یہ ہوا: صورت حال کی تبدیلی آپ بھی نہیں چاہتیں؟

''صرف میرے چاہنے سے کیا ہوگا؟

''ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ مگر.... آپ کو کچھ نہ کچھ بہر حال کہنا ہوگا۔

''بہت کچھ کہہ چکی ہوں۔

''رضا اور راضی کے آس پاس ہی کہیں آپ کی فطری ضرورت ہے جو..... جو آپ کی زندگی کی معراج ہے اور وہی اوروں کی لازمی ضرورت بھی ہے۔

''جانتی ہوں صاحب!

''زمین..... چشمہ، اُبال..... اور زمین کی پیاس۔ بادل ہے، مگر برستا نہیں..... لیکن ایلوپیتھی رپورٹ کچھ اور کہتی ہے۔

''عرض کر چکی ہوں، کچھ باتیں کہی نہیں، سمجھی جاتی ہیں۔ ایلوپیتھی ہو، یونانی علوم ہوں یا آپ کی علمی دُنیا کی ہوش ربا ترقیات، کہیں نہ کہیں سبھی کی سانسیں

پھولنے لگتی ہیں۔

''بالکل صحیح کہا.... اب یہ اور بتا دیجیے: اس کے بعد وہ کیا کرے جس کی سانس پھول اٹھے۔ میرے پاس تین نفر آئے، تینوں ہی کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور حل وہیں کہیں موجود ہے جس کی طرف آپ اشارہ کر رہی ہیں۔

''اشارے بھی کافی نہ ہوئے؟

''نبضیں بھی چپ سادھیں تو تہذیب کا ایک آدھ اصول الانگنا پڑتا ہے بی بی! دیکھیں میرا بھی سانس پھول چلا ہے مگر میں مایوس نہیں ہوا کہ زمین کی پیاس سے بات چلی اور سانسوں کے پھولنے تک آ پہنچی ہے۔

''تو..... تو پھر۔ سن ہی لیجیے.... میرا..... میرا گھنا.... گھنگور ابر..... زمین کے بجائے پلنگ کی چادر پہ برستا ہے۔

''ہوں....ں....ں

''اسے.... میں..... کیا سمجھوں؟ اثبات یا اشارہ؟

''دونوں۔

''حاصل؟

''ہوگا، یقیناً ہوگا، مگر اس کے لیے کوشش بھی آپ ہی کریں گی۔

''اپنی سی کوشش کر چکی ہوں۔

''ہر شخص اپنی زندگی میں ایسی کئی منزلوں سے گزرتا ہے جو عام طور پر امتحان کہی جاتی ہیں۔ ہر انسان اپنی زندگی کے کسی خاص امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا۔ وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہی نہیں اس کے وجود کا جوہر کیا ہے؟ آپ کی ساس پڑھی لکھی خاتون ہیں مگر افسوس کہ انہوں نے نعمت کو رحمت کے بجائے زحمت جانا اور اپنی کچھ ذاتی ترجیحات کے باعث انہوں نے اسے ایک عنوان دینے کی غلطی بھی کی، اور..... اور میں یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ یہ

غلطی بار بار دہرائی گئی ہے۔ جس کے باعث آپ کے شوہر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی احتیاط برت رہے ہیں۔ انہیں کل میرے پاس بھیج دیں، بس اک ذرا سی بنیادی بات ان سے کہوں گا مگر بڑا کام آپ کو کرنا ہوگا۔

''ہوں....ں....ں.....۔ اس مرتبہ ہنکاری میرے بجائے بہو نے بھری تھی۔

○○

پاسا

''ہم نے تمہیں چنا ہی اس کارن ہے کہ تم ساہتیہ اور اتہاس کی باریکیوں کا گیان رکھتے ہو۔ تمہیں کیول یہ کرنا ہے کہ ہماری کلپنا انوسار ایک کتاب لکھو۔

''آپ کی کلپنا کے انوسار؟ آپ.... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

''ہاں اس کتاب کا کانسپٹ ہمارا ہوگا۔ اتہاس لکھنے والوں نے کچھ ویکتیوں کو ہسٹری کے کوڑے دان میں ڈال دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے وہی

ہمارے پُرش تھے۔

''وہ مہان تھے یا نہیں؟

''ہمیں اس کا گیان نہیں ہے۔ پر ہمارے کچھ پرکھے کہہ گئے وہ بھی مہان تھے اور اب تو سرکار ہماری ہے۔ دیش کی بڑی آبادی میں ہم ہیں۔ آج تک جو بھی گزری ہے اس پر تمہیں زیادہ شبد خرچ نہیں کرنے ہیں۔

''پر اس سے..... ہوگا کیا؟

''ہوگا۔ اوشیہ ہوگا۔ ہمارے دیش پہ شدھ، سدھانتک اور ادھیاتمک سنسکرتی لاگو ہوگی۔

''مجھے..... مجھے تو نہیں لگتا میرا لیکھا جوکھا آپ کو کامیاب کر سکے گا۔

''وہ تو بعد کی سمسیہ ہے پترشلا۔ تمہیں کتاب لکھنی ہے۔ تمہاری تحریر لیکھ نہیں ہوگی بجلی ہوگی، بجلی، جلا کر بھسم کرنے والی بجلی۔ تم صرف لکھو گے شلا کے بیٹے، سرکار اپنے پریس سے اسے پرکاشت کرے گی اور یہ بھی یاد رکھو، اس کتاب کو تم دس بیس یا سو پچاس کے لیے نہیں لکھو گے۔ اسے لاکھوں کے سامنے سناؤ گے۔ کنبھ کے مجمع میں۔ سوچنے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں پترشلا! ہم کہہ چکے سرکار ہماری ہے۔ پولس ہماری ہے۔ سینا ہماری ہے۔ اور یہ سب پانے کی خاطر ہم نے پورے پچاس برس انتظار کیا ہے۔ وہ جو آج ہم پر اُنگلی اُٹھا رہے ہیں، تم دیکھو تو اُن کی اپنی تین اُنگلیاں خُود اُن کی اور اُٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے من کا چور ان کی اپنی طرف اٹھی اپنی انگلیوں کو سیدھا کرنا چاہتا ہے پر ان کا انگوٹھا انگلیوں کو دبائے ہوئے ہے اور..... پیارے پترشلا! ستیہ تو یہ ہے کہ آج جو ہماری طرف اُنگلی اُٹھا کر ہمارے وچاروں کا کھنڈن کر رہے ہیں، انہوں نے ان کے پرکھوں نے بھی یہی چاہا تھا۔ پر اس سمے ان وچاروں کے کھل کر پرکٹ کرنے کا موسم نہیں تھا۔ اس پل ضرورت تھی، ہم ایکتا کے گیت گائیں کیونکہ ہمیں ستا تک پہنچنے

کے لیے اسی کی آوشیکتا تھی۔ اور جب وے سامنے آئی تو ہم نے زبان کھولی تھی۔ آنکھوں میں ان کی بھی چمک پیدا ہوئی تھی پر انہوں نے موسم کی اور اشارہ کیا تھا اور کہا تھا: آج ضرورت ہے آپ سب ان وچار دھاراؤں پر چپکے چپکے کام کرتے رہیں۔ ہم بھی مانتے ہیں ہندوتو ہی قوم پرستی ہے پر اس کی بات کھل کر کرنے کا سمئے یہ نہیں ہے۔ شلا کے بیٹے! ہمارا وشواس کرو۔ وے سیکولرازم کی مالا جپتے رہے، ہم نے دیش کی شالاؤں میں اسے سبوتاژ کرنے کا کام آرمبھ کیا۔ سنسکرت گیان کے نام پردیش کے کلچر اور اتہاس کے بارے میں چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپی گئیں، شکشا سنسدوں، کندریوں میں پڑھائی گئیں۔ اور یہی کام صرف وہاں نہیں ہوا ہے..... سینا سے جو لوگ ریٹائر ہوکر کیول پینشن پہ گزارا کر رہے تھے ہم نے انہیں اپنے یووکوں کو تیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کیول اس لیے کہ اس دیش میں شدھ سدھانتک اور ادھیاتمک سنسکرتی ہو۔

''مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیجیے۔

''سوچو، اوشیہ سوچو، اور ساتھ ساتھ یہ بھی وچار کرنا کہ ہماری سرکار صرف تم ہی کو پہلا اوسر نہیں دے رہی ہے۔ ہم سے پہلے جو ستا میں تھے انہوں نے بھی یہ کام کیے ہیں۔ تم شلا پتر ہو، چھوٹی سی آیو میں تم نے بڑا نام کما لیا ہے۔ مگر آج بھی تم نے دُنیا پراپت نہیں کی۔ پرکاشن سنستھائیں تمہیں آج بھی ہاتھوں ہاتھ نہیں لے رہی ہیں۔ تمہیں اپنی کتاب پرکاشت کرنے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔

——O——

''وشواس کرو، ویسا نہیں ہوگا۔ آؤ، ہم سب پرارتھنا کریں..... پالن ہار ان سبھی کو اتنی بدھی دے دے کہ انہوں نے جو کچھ کھویا ہے، اسے پانے میں

سپھل ہو جائیں۔

''وہی تو یہ پانا چاہتے ہیں گرودیو۔

''انہیں تو یہی پتہ نہیں، انہوں نے کھویا کیا ہے۔

''آپ جانتے ہیں؟

''ہاں، جانتا ہوں۔ آج جو کچھ بھی پانے کی کامنا یہ کررہے ہیں، یہ وہ تو ہرگز نہیں جو کھویا گیا۔

''انہوں نے کھویا کیا ہے گروجی؟

''اپنا دھر، دھرم کی شدھ شکشا اور اس پر یعنی اس کی راہ پر چلنے کی شکتی کھوئی ہے۔ یہ..... یہ تو وہی کررہے ہیں جو انطا کیہ والوں نے کیا تھا۔ انہیں سمجھانے کے لیے ایک ہی سمئے میں ایک کے بعد ایک دو نہیں، تین تین مہان ویکتی آئے تھے۔ مگر انہوں نے ان تینوں کا کہنا نہیں مانا۔

''ہم میں اور ان میں کیا کچھ ایک سا ہے گروجی؟

''وچار دھارا ایک ہے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دھرم کی اصل شکشا انہوں نے بھی کھوئی تھی۔

''کھوئی نہیں بدل دی تھی۔

''ایسا کیوں کیا تھا، انہوں نے گرودیو؟

''اس لیے کہ لابھ کیول گنے چنے لوگوں کو ہو۔

''پر، وہ تو اوروں کا بھی خیال رکھتے ہوں گے۔

''کہتے تو یہی رہے پر انہیں اوروں کا خیال تب آیا جب ان کے کرموں کی وجہ سے جنتا بھوکوں مرنے لگی۔ اسی شکھشا کو ماننے والے آج اس دھرتی پر جہاں جہاں ہیں ان کے آس پاس کے لوگ باگ آج بھی پریشان ہیں اور ان کے گیانیوں نے اپنے اتیاچاروں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہی آئی۔ ایم۔ ایف۔

ڈبلیو۔ ٹی۔ او۔ اور جیون سرکھشا جیسی سنستھائیں بنا رکھی ہیں۔ وہ بھی ان ہی وچار دھاراؤں کے مالک ہیں جو اپنے دیش میں رام راجیہ چاہتے ہیں۔ تم جو سماچار مجھ تک پہنچاتے ہو نا اس کی جان کاری مجھے ہے۔

——○——

''میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اپنے قلم سے گھر بھر کا پیٹ پوری طرح نہیں بھر پا رہے ہو۔ لکھتے ہو اور جمع کرتے رہتے ہو۔ یہ..... دیکھیں تو یہ ایک اچھا اوسر تمہیں مل رہا ہے۔ اس سے بہت کچھ تم پالو گے۔ پر اس سے لابھ اُٹھانے سے پہلے تمہیں یہ بھی سوچنا ہوگا شلا، میں نے یا تمہارے دونوں بچوں نے تم سے کچھ کم ہونے کی شکایت کی ہے؟ ہم کر سکتے تھے شکایت کہ ہمارے جیون میں ایک پرکار کی ہلچل نہیں ہے۔ تم یہ نہ پوچھنا کہ کیسی ہلچل؟ بلکہ تمہیں اس وشئے پر خود سوچنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری سوچ کو ایک راہ خود ہی مل جائے گی، اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو گے، پر صرف آنکھیں کھولنے ہی سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں سوچنا ہوگا، جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ سب ویسا کیوں ہے جیسا دکھائی دے رہا ہے؟ ویسا کیوں نہیں جیسا ہونا چاہیے۔ پلیز تم مجھ سے نہ پوچھنا، ہونا کیسا چاہیے؟ میں تمہاری طرح گیان نہیں رکھتی۔ مگر جو بھی تم یا تمہارے جیسے لوگ لکھتے ہیں اسے پڑھ کر اسے سمجھنا چاہتی ہوں جو لکھا گیا ہے۔ لکھنے والے نے جو بھی شبدوں میں دیا یا دینا چاہا ہے وہ وہی ہے جو پروسا گیا ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ اور اگر تم برا نہ مانو تو کہوں تم نے اور تم سوں نے زیادہ تر اپنے باہر کی بے آرامی لکھی ہے۔ ہم جو جیون بھوگ رہے ہیں۔ وہ کچھ ایسا بُرا بھی نہیں کہ اسے پڑھنے والوں کے آگے نہ پروسا جائے۔

''تم میں تو اچھا بھلا آلوچک موجود ہے!

''وہ تو سب ہی میں ہوتا ہے۔ تم میں بھی ہے۔ میں نے تمہیں لکھتے اور اپنے لکھے کو کاٹتے بھی دیکھا ہے۔ یہ جو تم اپنا لکھا خود کاٹتے ہو، وہی تو تمہاری بدھی میں بیٹھا آلوچک ہے۔ شلا! اُس سے پوچھو، تمہیں اس اوسر کا لابھ اٹھانا چاہیے یا نہیں؟

''پوچھ چکا ہوں۔

''کیا کہتا ہے وہ؟

''وہ تو کہتا ہے بن سوچے نہ چل۔ کھڑا رہ، وِچار کر، پھر قدم اُٹھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے میں بھی کہہ چکی ہوں، جو زندگی ہم گزار رہے ہیں اس میں ایسا بہت کچھ ہے جو کہا اور سنا جائے۔

''پر..... وہ مجھ سے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ تو سدھانتک اور ادھیانتک سنسکرتی کی بات کر رہے تھے! ان کا کہنا یہ ہے کہ ہندوتو ہی قوم پرستی ہے۔

''تھوڑا بہت جو بھی اب تک میں نے پڑھا ہے اس سے اتنا تو جان گئی کہ ایک طرح کی دیش پرستی اور ہندو وِچار دھارا ہمارے ساہتیہ میں بھی پنپ رہی ہے۔ بھارتیتا کے نام پر اسی کی جڑوں کو پانی دیا جا رہا ہے۔ جرنلزم کا حال تو اور بھی بُرا ہے۔ پر وہاں بھی سچ بولتے موجود ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سمبندھ ایک دم سے توڑے نہیں جاتے۔ میرا اپنا وچار یہ ہے، تمہیں اس وشے پر خوب اچھی طرح سوچنا ہوگا، ان لوگوں سے پھر ملنا ہوگا، بات کرنا ہوگی۔

——O——

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، سمبندھ ایک دم سے توڑے جاتے ہیں نہ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تو پالن ہار بناتا ہے۔ کتابیں وہ نہیں کہہ رہی ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں۔ جنہیں آپ دُشمن مان رہے ہیں ان کی آیو ہی کیا ہے؟ اپنے دیش

میں بولی جانے والی زبان کا کھنڈن جس کارن کیا جارہا ہے، اس کا تو جنم ہی اس دھرتی پر ہوا تھا۔ اور شریمان ! موریہ یگ کے کتبات، اشوک کے کتبات ویسے تو نہیں لکھے گئے تھے جیسے ہم لکھ رہے ہیں، جس زبان کو آپ دُشمن کی زبان کہتے ہیں وہ تو یہاں یدھشٹر یگ میں بھی رہی ہے۔ اُس یگ میں آخر ہمارا ان کا رشتہ تھا، تو کون سا رشتہ تھا۔ پریم کا یا نفرت کا؟

''شلا کے بیٹے! تم یہاں بحث نہیں کرو گے۔

'' آپ مجھ سے کچھ ادھیکار بھی چھین لینا چاہیں گے۔

'' کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

''یہ بھارت ہے، اس کی اپنی پرمپرا ہے جس میں سنواد بہت ہی مہتو ہے۔

''اور اس سے تو ووادہوتا ہے۔

'' اسے آپ گیان سے بھی دور کر سکتے ہیں۔ آدان پردان ہو تو ووادخود ہی ختم ہو جائے گا۔

'' تم لیکھک ہو شلا پترا! اور ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ کیول ہماری وچار دھارا نہیں ہے۔ منوخود گیانی تھے۔ تپسّیا بھی کرتے تھے۔

'' جانتا ہوں شری مان۔ نہیں جانتا تو کیول اتنا کہ ورنا شرم نے اصل وچار دھارا سے ورودھ کیوں کیا؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں شلا پتر ہوں۔ اُنہوں نے، ان کے بزرگوں نے ہم کو تو صرف یہ بتایا ہے کہ اصل کار یہ کیول کرم ہے۔

'' تم پھر بحث کا دوار کھول رہے ہو۔ بھول رہے ہو کہ ہماری اچھا کیول ہماری اپنی اچھا نہیں ہے۔ یہ ہم نے ویدوں سے جانا ہے۔ اب تم سے یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ وید کا ارتھ جانتے ہو یا نہیں۔

'' آپ پوچھیں نہ پوچھیں پر مجھے پوچھنے کا ادھیکار تو ہے اور میں جان لینا چاہوں گا کہ ہندومت کی اصل وچار دھارا کیا تھی۔

''تم .....تم کیسے ہندو ہو؟ ہزاروں وَرشوں سے چلی آرہی شکھشا کو نہیں جانتے!

'' آپ تو بُرا مان گئے شری مان۔ میرا پرشن تو بہت ہی سیدھا ہے اور جو کچھ، مجھ سے آپ اور آپ کی ، میرا مطلب اپنی سرکار سے ہے، چاہتے ہیں اس کے لیے میرا یہ جان لینا ضروری ہے کہ منو کو اصل وچار دھارا سے کیا اسلاف تھا؟

''شلا پتر! ایسا کوئی سوال نہیں جس کا جواب نہ ہو۔ پر ہر پرشن کا اُتر نہیں دیا جانا چاہیے۔ کچھ سوال کرنے والے کو خود بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ تمہیں نربھئے ہوکر وہ کار یہ کرنا ہوگا جو سرکار چاہتی ہے۔ جن کے ورودھ میں ہم تمہیں یہ کشٹ دے رہے ہیں۔ ذرا ان کی اور دیکھو۔ اس پرکار کے کام وہاں بھی لیے گئے ہیں۔ ان کا اتہاس اُٹھاؤ، پڑھو، اور یادرکھو کہ سرکار تم سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔

—— ○ ——

'' میرا ماننا تو یہ ہے کہ تم وہ کام کرو۔

'' یار! میں نے تمہیں دوست جان کر یہ بات بتائی ہے اور تم نے فوراً ہی اِک دم سے اپنا وِچار پرکٹ کر دیا۔ سوچا نہ سمجھا۔ بھائی جی! وہ جو اُن سے پہلے ستا میں تھے، انہوں نے یہ کام کیوں نہ کیا؟ ذرا سوچتے، سمجھتے پھر رائے دیتے۔

'' یار! تم لیکھک ہو۔ پڑھے لکھے لیکھک، پتر شلا کے نام سے تم نے ناموری پائی ہے۔ تم خود سوچو، سوتیہ پاٹھک کو کتنے لوگ جانتے ہیں؟ میں یا بھا بھی، ہے نا؟ تمہیں یہ نام دینے والے بھی وہ نہیں پا سکے جو سرکار تمہیں دینا چاہتی ہے۔ تمہارے پتا جی نے تمہیں کیول نام دیا تھا اور وہ سورگباش ہوگئے۔ یادکرو، اُن کے متر کو جس نے تمہیں ساہتیہ کے ساتھ اتہاس لکھنے کا گر بتایا، تمہارا ایک نام رکھا، تم خود وِچار کرو، سیدھے سادے گیانی شلا پاٹھک کے جاننے والے آج

کتنے لوگ ہیں؟ لیکن تمہیں تو تمہاری کویتاؤں سے اور تمہارے پتا کے متر کی دور تک دیکھنے کی شکتی نے وہ ہنر سکھادیا کہ تم چھوٹی سی عمر میں ہی جانے بھی گئے اور مانے بھی، اور اب ہماری اپنی سرکار تم سے ایک کام لینا چاہتی ہے اور تم دبدھا میں پڑے ہو!

''مگر!

''اگر، مگر کو چھوڑو یار، اس شبد نے بڑے جھگڑے کھڑے کیے ہیں۔ آج بھی دُنیا میں اسی کے کارن سمسیائیں نہیں سلجھ رہی ہیں۔ میری مانو، اگر مگر کو ڈی فریزر میں رکھ دو۔ اور مان جاؤ کہ جو شکتی آج ستا میں ہے، اس میں اور اس سنستھا میں جو کل تک ستا میں تھی کوئی انتر نہیں ہے۔

''کیسی باتیں کرنے لگے؟

''سچ کہہ رہا ہوں یار! کچھ ستیہ پورم پور ننگے ہوتے ہیں اور کچھ ڈھکے چھپے۔

''ستیہ تو سدا ہی ننگا رہا ہے۔

''دماغ خراب ہوجائے گا، اگر دُوِدھا میں پڑے۔ ہاتھ بڑھاؤ، پیالہ اٹھاؤ، اِدھر اُدھر نہ دیکھو۔ تمہیں وچار میں ڈوبا، دیکھ کر دوسرے تمہیں دھکیل پیالہ اُٹھالیں گے۔

''پر یہ تو سوچ یار! وشوکاہر دھرم اپنی کتاب کو کسی نہ کسی ویکتی سے سمبندھت کرتا ہے۔ پر ہمارا ویکتی کون ہے؟ اور ہماری کتاب کون سی ہے؟ گیتا، رامائن، ویدوں میں رگ وید، اتھروید، یجروید، یا اُپنشد۔ کوئی بتلائے کہ ویدوں کا نزول کن پہ ہوا؟ ایشوروانی کس پر اتری؟

''ان سوالوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ مان کر چلو کہ ہندو دھرم سب سے پرانا ہے۔ تم سے وہ اتہاس لکھوانا چاہتے ہیں۔ اب تمہیں یہ تو نہیں بتاؤں گا کہ تمہارا کام کیا ہے؟ پھر بھی کہنا تو پڑے گا ہی۔ بس پیارے

یہ جان لو۔ اتہاس لکھنے والے کا کام اپنے زمانے کے واقعے کو دکھا دینا ہے یعنی لکھ دینا بس۔

''واقعہ سچا ہو یا جھوٹا؟

''اس پر سوچنا پڑھنے والے کا کرتو یہ ہے۔ اگر اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ ہے تو یہ کام وہ خود کرے گا۔

''اور اگر وہ نہ ہوں تو؟

''تو پھر وہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس دھرتی پہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے ہونے دیا جائے۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں بھائی؟ ہمیں تو یہیں رہ کر جینا ہے۔ اور یہ بھی تو دیکھو کہ ہم اکیلے نہیں ہیں، بیوی ہے، بچے ہیں۔ ماں باپ ہیں۔

''وہ سب تو ان کے ساتھ بھی ہیں جن کے خلاف ہماری سرکار ہے۔

''ہیں تو۔

''کیا یہی انصاف ہے؟

''نہیں انصاف تو نہیں ہے۔

''تو پھر تم اسے کیا کہو گے؟

''ظلم یعنی اتیاچار، لیکن تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو یار؟

''کچھ نہیں میں تو خود سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی تم نے ایک ہی شبد دو طرح کہہ دیا اور ذرا پہلے تم کہہ چکے ہو کہ انصاف نہیں ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں جو اتیاچار کرے اسے اتیاچاری ہی کہتے ہیں نا؟

''بالکل!

''میرے خیال سے تو اتیارچارک وہ ہوتا ہے جس میں خامی ہو اور بھائی

میرے سب سے بڑا عیب تو ہمارے دماغ میں پیدا ہونے والی نفرت ہے۔ اور وہ جو مجھے ہانک کر اپنا کام کروانا چاہتے ہیں وہ ہماری اپنی بدھیوں میں اپنے ہی جیسے ویکتیوں کے وِرُدّھ نفرت ہی تو پیدا کروانا چاہتے ہیں۔

''اور تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے؟

''ابھی تو میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے۔

''میرے خیال سے تمہیں ان کا کہنا مان ہی لینا چاہیے۔

''اور اگر انکار کروں تو؟

——O——

''مجھے یقین ہے، وہ ایسا نہیں کرے گا، پیدا کرنے والے نے اُسے عقل دی ہے۔ دیکھنا ہے وہ اس کا پریوگ کس طرح کرتا ہے۔

''بدھی تو ان کے پاس بھی ہے گرو جی جو ستا میں ہیں۔

''وہ تو صرف ستا چاہتے ہیں۔ بدھی کس طور برتیں، جانتے ہیں وہ، پر برتنا نہیں چاہتے کہ اس سے ان کے پاس مال کم ہو جائے گا۔ وہ تو کیول یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے محتاج ہو کر جئیں۔ لوگوں کو بھی پالن ہار نے بدھی دی ہے۔ مگر بہتوں کی عقلیں چمک دمک دیکھ کر، ان کے موہ میں اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ کیونکہ جن کے پاس سرکار ہوتی ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ گیان سے جو وہ پا چکے ہیں وہ دوسروں تک نہ پہنچے۔ اسی لیے وہ گیانی سے کہتے ہیں ''اپنی حالت پر رہو، اس پرکار کی باتیں نہ کرو اور یدی کہنے پر مجبور بھی ہو جاؤ تو یوں کہو کہ سننے والے اسے سمجھنا چاہیں، تب بھی نہ سمجھیں۔

''اور وہ ایسا کرتے ہیں؟

''ہاں۔ اگر اتنے پر ہی تھمے رہتے تب بھی بُرا ہونے کے باوجود بُرا نہ

ہوتا۔ انہوں نے تو مایا کے موہ میں کھوٹوں کو کھرا ثابت کرنا چاہا اور ابھی ابھی جو خبر تم لائے ہو، وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس دھرم کا پرچار وہ کر رہے ہیں، صحیح ارتھ میں وہ دھرم ہی نہیں ہے۔

''بھولتے ہو تم۔ یاد ہے، تم سے میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اپنا دھرم اور اس کی شکھشا کھو چکے ہیں۔

''کون پائے گا اسے؟

''جسے اس کی تلاش ہوگی۔ اسی کا پرکاش انہیں وہاں تک پہنچا دے گا۔

''یہ سمبھو ہے؟

''ہاں ممکن ہے۔ کیونکہ جہاں بُرائی ہے، وہیں کہیں آس پاس ہی اچھائی بھی موجود ہے۔ یاد کرو، اندھیارے میں سے ہی کرن نکلتی ہے۔

''پر وہ تو شلا کے بیٹے سے کچھ اور چاہتے ہیں۔

''یہی نا، جو کھرے ہیں، انہیں کھوٹا لکھو۔ اور کھوٹے کو ایک دم کھرا ثابت کرو۔

''جی گرو جی۔

''ان کی کوششیں ساکار بھی ہوگئیں تو بھی ستیہ صرف سچ ہی رہے گا۔ اس وشال دھرتی پر جو بھی آج ہو رہا ہے، وہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا۔ یہ بھولتے ہیں بھارت کی سیماؤں کے اُس پار بھی دھرتی ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ کہتے ہوں گے، ہماری وِچار دھارائیں بھی وہاں تک پہنچتی ہیں۔ پر انہیں کیا پتہ، یہ وہاں پہنچے ہیں یا وہ یہاں آ چکے ہیں۔ وہ جنہیں سمجھانے کو کئی کئی مہمان ہستیوں کو بھیجا گیا تھا۔

——○——

''آخر تم آ ہی گئے شلا پتر۔ آؤ، بیٹھو، بتاؤ، تم نے کیا فیصلہ کیا؟

'' فیصلہ تو اُسی روز کر چکا تھا شریمان، یہ دیکھئے! اب تک اتنا لکھا ہے۔ چاہا آپ دیکھ لیتے۔ تھوڑا وچار وِمرش کرتے۔

''دیکھو بھائی! تم کون ہو، کس کے پتر ہو، ہم جانتے ہیں، ہماری سرکار کے اور سدسیہ بھی جانتے ہیں۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟ وہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں۔ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کام کب تک ہو جانا چاہیے۔ کمبھ سے مہینہ بھر پہلے کتاب کو چھپنا بھی ہے اور دیش بھر میں کتابوں کی دُکانوں پر پہنچنا بھی ہے۔ تمہیں اس کے کچھ انش کمبھ میں پڑھنے ہوں گے۔ وہیں کتابیں بھی ہوں گی، خریدنے والے اسے خریدیں گے۔ جو نہ خرید سکیں گے، انہیں ہمارے کاریہ کرتا سرکار کی اور سے دیں گے کہ لوگ جان جائیں، ہم، ہمارے پرکھے کتنے ان ہیں اور وہ جنہیں مہان کہتے ہیں، اتنے مہان نہیں ہیں، جتنے بتائے جاتے ہیں۔ اس وشے پر ہم تم سے کیا وِچار وِمرش کریں گے۔ تم تو شلا پتر ہو۔ تم سے پہلے بھی ایک پتر یہ کام کر چکے ہیں۔ بس تمہیں یہ کاریہ کرتے اس کا دھیان رکھنا ہوگا کہ سورگ پتر کی طرح اتہاس لکھتے سمئے چھان پٹک نہ کرو۔ تمہیں ہندو دھرم کی اصل وچار دھارا سے یہ بتانا ہوگا کہ منواسمرتی کے انوسار منشیہ پیدائشی طور پر چار طبقوں میں بٹا ہوا ہے، ہم تو تم سے بتا ہی چکے ہیں کہ ہماری سرکار کیا چاہتی ہے۔ ہم تو کیول شدھ (پاک صاف) سدھاتنک (اصولی) اور ادھیاتمک (آتمک/ روحانی) سنسکرتی کو پورے بھارت میں لاگو کرنا چاہتے ہیں۔ وے جو سنسد میں وپرش ہیں ان سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ان کی اپنی مجبوری کا ہمیں بھی گیان ہے، ہم جانتے ہیں کہ اپنے دیش سے انہیں کھدیڑنے میں، جن کے راج میں سورج ڈوبتا ہی نہ تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ تھے جن کے ہاتھوں سے سفید چمڑی والوں نے

راج چھپتا تھا۔ ہم جب ان کے وِرُدّھ رہے تبھی برہما نے جنہیں اپنے سر سے جنم دیا تھا یہ فیصلہ لے چکے تھے کہ دیش کا راج پھر ان ہاتھوں میں نہیں جانا چاہیے۔ نہ ہی ان میں سے کسی کو اپنے راج پاٹ کا ساجھے دار بنانا چاہیے۔ لیکن اس یگ کے پرشوں نے اپنی مجبوریوں پہ پردہ ڈالنا ہی ضروری سمجھا تھا۔ پھر جو کچھ بھی ہوا۔ سبھی کو پتہ ہے اور اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے ستا ہمیں سونپنے کے لیے انہیں ورشوں لگ گئے۔ دوش ان کا بھی نہیں ہے۔ پر، ہم ان ہی کو دوشی مانتے ہیں اور.....اب تمہیں یہ بتانا ہے کہ دوشی ہم نہیں وہ ہیں جنہوں نے ہم پہ آکرمن کیا اور برسوں ہم پر راج کر گئے۔

''ٹھیک ہے۔ وہی سب ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔

''جانتے ہونا، ہمارا دُشمن کون ہے؟

''جی ہاں شریمان! جانتا ہوں، پہچانتا بھی ہوں اور........

——○——

''مدتوں سے مجھ سے کہا جا رہا تھا ایک ایسی کتاب لکھو جس میں ان کی حقیقت بیان ہو جن کو کچھ لوگ ورشوں سے پسند نہیں کر رہے۔ بہت سوچ وِچار کے بعد میں نے اس کاریہ کو ہاتھ میں لیا۔ پربھو کی کرپا ہے کہ آج یہ کتاب دیش بھر میں موجود ہے۔ سرکار کے کچھ کاریہ کرتاؤں کا کہنا تھا کہ اس کتاب کے کچھ حصے مجھے اس مجمع کو بھی سنانے ہوں گے جو آج یہاں موجود ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو یہاں اشنان کرنے آئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو یہاں پوجا پاٹ کریں گے نہ اشنان، وہ کیول یہ دیکھنے کے لیے یہاں موجود ہیں کہ کمبھ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ ان ہی میں وہ بھی ہیں جو سدھاتمک، ادھیاتمک اور شدھ سنسکرتی کے وِرودھی ہیں۔ اگر ہم وِچار کریں تو جان لیں گے کہ وہ کون

ہیں۔ سرکار کا کہنا ہے کہ یہ وہی ہیں جنہوں نے ہمارے دیش پر آکرمن کیا اور پھر یہیں رچ بس گئے۔

لیکن یہ تو کیول آدھا سچ ہے۔ ایک ہزار چھوسو چھ ورش پہلے گرجتے بادلوں سمان ایک طوفان اور بھی آیا تھا۔ اسے ہمارے کچھ اتہاس کار غزنویوں کا طوفان کہتے ہیں۔ وہ بادلوں کی طرح آیا اور آندھی کے سمان چلا گیا۔ اس کے آنے اور جانے کا اپنا ایک اتہاس موجود ہے جس کے پنّوں میں کئی ستیہ موجود ہیں۔ ایمان کی کہوں تو آکرمن کرنے والا وہی تھا..... اور ایک ستیہ جو ہم میں سے زیادہ لوگ نہیں جانتے، وہ یہ ہے کہ ہماری دھرتی پر وہ بھائی جو آج ہمارے دُشمن ہیں دو راستوں سے آئے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو سندھ اور ملتان سے ہوتا ہوا یہاں آیا اور چلا گیا۔ اسی راستے سے ایک کو خود ہم نے نیوتا دے کر بلایا۔ یہ وہ تھا جس کا راج پاٹ اس کے باپ کے سورگباش ہونے کے بعد اس کے چچا نے ہڑپ لیا تھا۔ مگر دوسرا ستیہ تو یہ ہے بھائیو! اس سے بہت پہلے سے ہی ہمارے دیش میں عربوں کا آنا جانا رہا۔ جن کو ہم اپنا دُشمن کہہ رہے ہیں اور جن سے ہم میں سے بہت سے لوگ آج بھی ڈرے ہوئے ہیں، وہ تو پچھمی ساحلوں سے اس دیش میں زیتون کا تیل اور اپنے ملک کی کھجوریں لے کر آیا کرتے تھے۔

ایک ہزار چار سو تیس ورش پورو جب وہاں، نہیں ہے کوئی مالک کیول اللہ کے، کی آواز گونجی تھی تب یہاں سرندیپ کے راجا کو سب سے پہلے اس کا پتہ چلا تھا۔ سرندیپ اور اس کے آس پاس کے راجاؤں کو جب اس کا گیان ہوا تھا تبھی انہوں نے ایک بدھی مان کو جانکاری کی خاطر بھیجا تھا۔ مدتوں بعد جب وہ مدینہ پہنچا تو وہ مہان ہستی اُن میں نہیں رہی تھی۔ ہاں وہ ہستی تھی جو خود ودّیا میں ڈوبی ہوئی تھی یا ودّیا اُن میں رچی بسی تھی۔

پیارے بھائیو! میں نے اس کتاب میں لکھ دیا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نہیں

ہے کوئی سوائے اللہ کے، ہمارے بھارت میں دو راستوں سے آئے ہیں۔
زمین پہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے اور اپنی کشتیوں کو کھیتے ہوئے۔ ہماری سرکار جنہیں دُشمن کہہ رہی ہے۔ جنہیں دُشمن مانتی ہے۔ انہیں پہچانتی بھی ہے یا.....

''اوم نمشیہ سوائے

''اوم.....!

''رام نام ستیہ ہے۔

''رام، رام، رام، رام۔

''ہے رام، اب کیا ہوگا؟

''زمانے کی سوگندھ، منشیہ گھاٹے میں ہے۔

○○

تشخیص

''کل جب تک کل رہتا ہے ہمیں اچھا نہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے راستے بھی بہتر معلوم ہوتے ہیں، خواہ ان میں ہزار اڑچنیں ہوں۔ لیکن.....

انصاری روڈ کے اپنے چھوٹے سے مطب میں مجھ سے باتیں کرتے حکیم محمد رفیع نے بات ادھوری چھوڑنے کے بعد مجھے غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں

میں غور و فکر اپنے پورے وجود کو پھیلانے اور سمیٹنے کے عمل میں مصروف لگے۔ حکیم صاحب کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ اک ذرا سے وقفے کے بعد وہ آہستگی سے سکڑتیں، نینوں کے پٹ پل بھر کو بند ہوتے اور اسی لحظہ ان کی فراخ پیشانی پر بل بھی پڑ جاتے۔ میری طرف سے جواب میں خاموشی پانے کے بعد آنکھوں کے کواڑ آہستہ سے کھلتے اور ایک تھکا ماندہ تبسم ان کے ہونٹوں پر اُتر آتا۔ سڑک پر سے گزرتے رکشہ چلانے والوں کی آوازیں، ٹھیلوں کے بھونپو اور تانگہ چالکوں کی ہک ہک کی آوازیں ان کے اور میرے بیچ حائل تو ہوتی رہی تھیں لیکن ان سے ہمارے درمیان ہوتی گفتگو متاثر نہ ہوئی۔ اب خاموشی کا وقفہ جب طویل ہونے لگا تو میں سوچنے لگا، حکیم صاحب نے غالباً اس لیے درمیان میں بات چھوڑ دی ہے کہ وہ سوچ رہے ہوں گے، میں کس سے مخاطب ہوں؟ یہ میرے بھتیج داماد کے ماموں ہی تو ہیں۔ مشینی شہر میں جیتے ہیں، سال بھر میں صرف ایک مرتبہ اس چھوٹے سے شہر مظفرنگر آجاتے ہیں۔ اس شہر سے ان کا تعلق بھی صرف ڈیڑھ گرہ کا ہے۔ میں اپنی پریشانی ان سے کیوں بیان کر رہا ہوں؟ ان کے سامنے سگریٹ پھونکتا میں بھی ان ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ روبرو چوکی پر بیٹھے حکیم صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے مجھ سے کہا:

''آپ مجھے اکثر یاد آجاتے ہیں۔ محسنہ اور منظر میاں سے آپ کی خیریت دریافت کر لیا کرتا ہوں۔

انہوں نے اپنی بھتیجی اور میرے بھانجے کا نام لیا۔ اپنی مسکان کو اک ذرا دبیز کیا، پھر بولے:

''آپ بھی ہمیں یاد کرتے ہیں نا؟

''آپ بھولنے والی ہستی نہیں جناب! نہ ہی وہ علم جو شیتنی وراثت میں آپ نے پایا ہے۔

حکیم صاحب کے ہونٹوں پہ موجود مسکراہٹ اور ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں ہمیشہ نظر آنے والی چمک کئی بار متغیر ہوگئی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد اسے خارج کرتے ہوئے بولے:

''بھائی! زمانہ بدل چکا ہے۔ شکر ہے پیدا کرنے والے کا۔ پرکھے زمین چھوڑ گئے۔ بھائی صاحب اس کی نگہداشت کا فرض بھی ادا کرتے ہیں اور..... ہفتے میں ایک مرتبہ بزرگوں کے مطب میں بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک آدھ مہینے میں کوئی مریض آجاتا ہے۔ وہ تو کہہ بھی سکتے ہیں، گاؤں ہے۔ میں یہاں مظفرنگر میں ہوں، مگر شہر کا تو منظر ہی بدل چکا ہے۔ ہم ہیں، مطب ہے، حقہ ہے، مریض بھی آجاتے ہیں۔ پروردگار کا کرم ہے۔

''بے شک اللہ کا کرم ہے۔ میں بھی دیکھتا ہوا ہی آرہا ہوں۔ شہر میں پیتھالوجیکل لیبارٹریز کی بھرمار ہے۔ پیتھیوں پہ پیتھیاں اور ان کے ماہرین آن بسے ہیں۔

''انقلابات ہیں زمانے کے۔

''بُرا نہ مانیں تو میں کچھ دریافت کروں۔

''بھئی گومتی کا پانی پیا ہے آپ نے؟ بہتی تو یو۔ پی ہی میں ہے، پر اس طرف نہیں جو آپ تکلف فرمارہے ہیں۔

حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو میں نے پوچھا:

''ابھی جن ماہرین کا ذکر کیا ہے، ان پر خود آپ کا تبصرہ کیا ہے؟

حکیم صاحب نے پھر پہلو بدلتے ہوئے چوکی پہ موجود سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکالنے کے بعد اسے ہونٹوں میں دبایا اور ماچس کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اپنی جیب سے لائٹر کر نکال اُن کی سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے جواب طلب نظریں ان پر مرکوز کر دیں۔ وہ کچھ نہ

بولے۔ سگریٹ کے دو تین کش لیے، چٹکی بھر راکھ زمین پر ڈالی اور کہا:

''یہ تو اسناد کا دور ہے۔ حقیر کے پاس تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔

''پشتینی علم اس کا محتاج بھی ہوا کرتا ہے؟

''آج کے تقاضے مطالبے تو کرتے ہیں کیونکہ میزان کے معیار بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔

''تو پھر ان ہی پہ کچھ فرمائیں۔

''بھائی میاں! علم..... مختلف خانوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور یہ اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ اسے مادی ضرورتوں کے حصول میں کامیابی کے لیے استعمال کیا جائے۔ میں تو ایک چھوٹے سے شہر میں جی رہا ہوں، آپ تو بڑے شہر میں زندگی گزارتے ہیں۔ ابھی جو کچھ میں نے کہا، آپ تو اسے بڑے پیمانے پر دیکھتے ہوں گے۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو سگریٹ کا ایک اور کش لینے کے بعد اس کا دھواں نتھنوں سے چھوڑتے ہوئے وہ کہنے لگے:

''سچ سچ بتائیں، آپ میں سے کوئی ان باتوں پر کبھی سوچنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے؟ کرتا ہے تو بے حد اچھی بات ہے۔ نہیں کرتا، تو کرنا ہوگا کہ علم خواہ کوئی ہو، اسے انسان کی فلاح کی خاطر ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں، آپ کہیں گے دعوے یہی کئے جاتے ہیں۔ لیکن شفاخانوں کے باہر لگی قطاریں کیا کہتی ہیں؟ ابھی جن لیبارٹریز کی بات ہوئی، وہاں لوگوں کی بھیڑ تو کچھ اور کہتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا میرے پاس کوئی سند نہیں ہے لہٰذا مجھے سوال کرنے کا حق ہی نہیں۔ مگر وہ جو اپنی دیواروں، ریکوں کو اپنی علمی استعداد کی ڈگریوں سے سجائے ہوئے ہیں، وہ تو غور کریں، انہیں سند کیوں دی گئی؟ خون، تھوک، پیشاب، ٹٹی کی جانچ دوسرے کریں تو پھر آپ مسیحا کیسے ہوئے؟''

''ان باتوں پر کوئی غور نہ کرے گا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو حکیم رفیع مسکرانے لگے۔ انہوں نے ذرا سے سلگتے سگریٹ کے ٹوٹے کی تپش انگلیوں میں محسوس کی تو سگریٹ کے پیکٹ میں سے دوسرا سگریٹ نکالنے کے بعد اسے ہونٹوں سے لگایا اور ٹوٹے سے نیا سگریٹ جلا کر سلگتے ٹوٹے کو زمین پر ڈال دیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

''بہتر کی جستجو اصلیت جانے بغیر، اس کے مقصد کو سمجھے بنا، ہماری تگ ودو، کل..... آنے والے روشن کل کی آرزو ہمیں اوروں کی حق تلفی پر مجبور کرتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں، کل جب تک کل رہتا ہے ہمیں اچھا نہیں، بہت اچھا لگتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے راستے بھی بھلے لگتے ہیں۔ خواہ ان میں ہزاروں روکاٹیں ہوں۔ لیکن اس تک ہم یا وہ ہم تک جب پہنچتا ہے تو..... اس کی معنویت ہی بدل جاتی ہے اور جب ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ پھر کل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاتھ آتی ہیں یادیں، بھلی بُری، حوصلوں کے ٹوٹنے، ارمانوں کے بکھرنے اور سب کچھ بدل جانے کے کربناک لمحوں کی اذیت ناک یادیں۔

وہ خاموش ہو گئے۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور ایک طویل کش لیا۔ سگریٹ کے سلگتے کونے میں یادیں راکھ ہونے کے عالم میں تھیں یا ان کے طفیل ملی تکلیف۔ میں سمجھ ہی نہ سکا۔ جی چاہا سوچ کو زبان مل جائے مگر تعلق کی نزاکت کے خیال نے اجازت نہ دی تو میں نے خود بھی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس میں سے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں کی طرف بڑھا ہی رہا تھا کہ حکیم صاحب بولے:

''آپ سنائیں، ٹھیک تو ہیں نا؟ اب تو کمر میں درد نہیں ہوتا؟

جواب میں مسکراتے ہوئے سر کو نفی میں ہلاتے مجھے یاد آیا، پچھلے سال جب میں آیا تھا تو اپنے شہر سے کمر کا درد اور آرتھوپیڈک ماہرین کے تجربے بھی ساتھ

لیتا آیا تھا اور حکیم صاحب کی دو روز کی دوا سے شفایاب ہوکر لوٹا تھا۔

''ذیشان کا خط آتا ہے تب بھی آپ یاد آجاتے ہیں۔ پچھلے دنوں اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ آیا تھا۔

انہوں نے میرے ایک دوست کی بات چھیڑی جو اُن کا بھی عزیز ہے۔ وہ کہہ رہے تھے:

''دہلی، آگرہ ہوآیا، بھائی صاحب سے ملنے کوال بھی گیا تھا۔

''شہزادے قلعوں اور مقبروں کے علاوہ اپنے جہاں کو پسند کرتے ہیں۔''

''وہ ان میں سے نہیں ہے بھائی! ہوتا بھی تو اب قلعے اور مقبرے عجائب خانے بن چکے۔ ان کے بارے میں بتانے والے بھی خال خال ہوں گے۔ کون جانتا ہے بادشاہ گر برادران میں سے ایک کی لاش ہمارے کوال سے گھسیٹتے ہوئے ان کے محل تک لے جائی گئی تھی۔

سگریٹ کا آخری کش لگانے کے بعد انہوں نے ٹوٹا زمین پہ ڈالا، چوکی پر سے اپنا دایاں پیر اٹھا کر جوتا پہنا اور پنجے والے حصے سے بجی ہوئی جلتی سگریٹ دو تین بار مسل کے پیر چوکی کے اندر کرتے ہوئے جوتا اُتار دیا۔ میں نے دیکھا، سگریٹ کا تمباکو راکھ کی سیاہی میں رل مل سیاہ سورج کی طرح زمین پر موجود تھا۔

''حکیم صاحب! جو جانتے بھی ہیں آخر وہ کتنا جانتے ہوں گے؟ اپنا سر اُٹھاتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔

''بس اسی قدر، جتنا اور جیسا وقائع نگار کو حکم دیا گیا ہوگا۔

''ہوسکتا ہے۔

''بہتر ہوگا یہ کہیں، یہی تو ہوتا آرہا ہے۔ سچ کے نام پر جھوٹ اتنا بولا جاتا ہے کہ سچ لگے۔

''حضور! لگنے اور ہونے کے فرق سے تو آپ خوب واقف ہیں، آخر کو

خاندانی طبیب ہیں۔ سچ بتایئے آپ کے حافظے میں کتنے سچ دفن ہیں؟

حکیم رفیع نے معنی خیز نگاہوں نے مجھے دیکھا، مسکرائے، پھر پہلو بدلتے ہوئے بولے:

''کئی ہیں۔ مگر بیان اس لیے نہیں کرتا کہ کچھ سچ مستور ہی اچھے لگتے ہیں۔ اک ذرا سے لب ہلے تو معاشرہ تاشے بجانے لگتا ہے۔ ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ عصبیت کہتے ہیں اسے۔

''حق اور اس کا اظہار عصبیت کے دائرے میں کیسے آسکتا ہے؟

''اگر کسی کی دل آزاری ہوتی ہو تو آسکتا ہے بھائی۔

''دلیل تو عمدہ پیش کر دی آپ نے۔

ایک طویل کش کا دھواں فضا کے سپرد کرنے کے بعد میں نے سگریٹ کا ٹکڑا سڑک کی طرف اچھال دیا۔ کچھ دیر حکیم صاحب کی پیش کردہ دلیل پر غور کیا تو محسوس ہوا جواب دینے کی خاطر میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ شکست خوردہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے خجالت آمیز مسکان اپنے ہونٹوں پہ سجائی تو وہ بھی مسکرانے لگے۔ انہوں نے ملازم کو پکارا، اس کے آنے پر اسے چائے بنوانے کو کہا اور پھر سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اسی وقت مطب کے سامنے ایک جیپ آکے رکی۔ سفید کرتے پجامے میں ملبوس ایک شخص نے اُتر کر حکیم رفیع کو دیکھنے کے بعد اپنے وجود کو اِک ذرا سا ترچھا کرتے ہوئے گاڑی میں موجود سواری کو حکیم صاحب کی موجودگی کی اطلاع دی۔ ہم نے دیکھا جیپ کا عقبی دروازہ کھلا، دو برقع پوش عورتیں اُتریں۔ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر بیٹھے صاحب بھی اُترے اور اُن عورتوں سے پہلے مطب میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے بلند آواز میں سلام کیا تو جواب دیتے ہوئے میں نے کرسی چھوڑ دی۔ آنے والے نے بیٹھنے سے پہلے اپنی جیب سے رومال نکالا اور خواتین کو مطب میں داخل ہوتے

دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ حکیم رفیع نے سب ہی پر اُچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد عورتوں کو لانے والے شخص کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولے:

''ہم جندر پور کے ہیں، اس وقت دہلی سے لوٹتے ہوئے والد صاحب کے حکم پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ دہلی، انہیں دکھانے لے گئے تھے۔

انہوں نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے عورتوں کی طرف اشارہ کیا تو ان میں سے ایک نے کرسی پر پہلو بدلا۔ حکیم رفیع نے چوکی کے بالکل قریب موجود کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مریضہ کو اس پر منتقل ہونے کے لیے کہا۔ چھوٹے چھوٹے دو قدم اُٹھانے کے بعد مریضہ بتائی گئی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اسی دوران چائے آ گئی۔ حکیم صاحب کے اشارے پر ملازم نے پیالی میری طرف بڑھائی۔ پیالی لیتے ہوئے میں نے سنا جندر پور والے صاحب حکیم رفیع سے کہہ رہے تھے:

''ان کی بیماری سے ہم سب پریشان ہیں۔ دہلی کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ طرح طرح کے ٹیسٹ ہوئے، علاج ہوا، پر افاقہ نہ ہوا۔

''آپ سب دہلی سے آرہے ہیں، تھک گئے ہوں گے۔ آپ کی خاطر چائے منگاؤں؟

حکیم رفیع کے دریافت کرنے پر اس شخص نے منہ بنا کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''آپ چائے پئیں، اس بیچ میں ساری باتیں بیان کرتا رہوں گا۔

''آپ زحمت نہ کریں.....!

حکیم صاحب نے اپنی پیالی چوکی کے بائیں طرف صندوق پہ رکھ دی اور قریب بیٹھی خاتون سے نبض دکھانے کے لیے کہا تو اس عورت نے برقعہ میں سے ہاتھ نکالا، دوسرے ہاتھ سے برقعے میں ڈھکا دوپٹہ کھینچا، اپنی کلائی پہ ڈالنے کے بعد ہاتھ حکیم کی طرف بڑھا دیا۔ وہ زیرلب کچھ پڑھتے ہوئے اپنا ہاتھ مریضہ کی

کلائی کی طرف بڑھا رہے تھے۔ عورتوں کے ساتھ آئے مرد نے جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اپنے لیے سگریٹ نکالی اور جب وہ سگریٹ ہونٹوں کی طرف بڑھانے لگا تب اس کی نگاہ چوکی پہ موجود حکیم رفیع کے سگریٹ پہ پڑ گئی۔ ہونٹوں کی طرف بڑھتا ہاتھ تھما، ایک سگریٹ پیکٹ میں سے اُکسا کر پیکٹ حکیم رفیع کی طرف بڑھایا گیا تو انہوں نے سر کی جنبش سے انکار کیا اور خاتون سے دوسرا ہاتھ دِکھانے کا اظہار کیا تو مریضہ نے مطلوبہ ہاتھ کی کلائی بھی دوپٹہ ڈال کر حکیم رفیع کی طرف بڑھا دی۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے پیالی کی آدھی چائے میں پی چکا تھا۔ دو بڑے گھونٹوں میں باقی چائے ختم کرنے کے بعد جب میں پہلو بدل رہا تھا تو دیکھا، حکیم رفیع نے مریضہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ساتھ آئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے:

''بھئی!.....انہیں تو.....کوئی مرض نہیں۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ دوسری خاتون حکیم رفیع سے مخاطب ہوئی۔

''پچھلے دس بارہ برسوں سے دورے پڑ رہے ہیں اسے۔ بیٹھے بیٹھے اس کے ہاتھ پیر اینٹھ جاتے ہیں۔ عجیب عالم ہوتا ہے حکیم صاحب! پہلے تو ہم جندر پور کے ڈاکٹروں کو دکھاتے رہے۔ پھر شہر بھر میں جس ڈاکٹر کی شہرت ہے اُسے دکھایا۔ انہوں نے کئی ٹیسٹ کروائے، دوائیں دیں، اینٹھن کم تو ہوئی پر، جا کے نہ دی۔ ان ہی کے کہنے پر ہم اسے دہلی لے گئے۔ ایک دو مرتبہ نہیں، کئی بار گئے جی، کل ڈاکٹر صاحب نے ایک اور شفاخانے بھیجا تھا۔ وہاں اس کا آدھا بدن مشین میں ڈال دیا گیا اور ضیغم سے کہا گیا شام کو آ کے رپورٹ لے جائیں۔ شام کو جب ضیغم وہاں سے رپورٹ لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو وہ بولے، رپورٹ تو بتا رہی ہے سب ٹھیک ہے اور اب.....اب آپ بھی کہہ رہے ہیں اسے کوئی بیماری نہیں۔

''میں نہیں کہہ رہا ہوں بی بی، اس کی نبض کہہ رہی ہے۔

''تو پھر دورے کیوں پڑتے ہیں؟ یہ..... یہ کسی جھپیٹے میں آ گئی ہو، یہی سوچ کے ہم نے کئی لوگوں کو بلایا حکیم جی! کئی نے فال کھولی، زائچہ بنا، حاضرات کا عمل ہوا۔ غرض..... نوٹ بٹور عامل تو چلے گئے پر اس کے دوروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔

حکیم صاحب نے ساری روداد توجہ سے سنی اور پھر صندوق پہ رکھی چائے کی پیالی اُٹھائی، چائے پانی ہو چکی تھی، انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پیالی اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اُٹھائی تھی، اس کے بعد اپنے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے اُس خاتون سے بولے، جو اُن سے مخاطب تھی:

''آپ ان کا بیاہ کر دیں بی بی۔

حکیم صاحب کے قریب بیٹھی مریضہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر اپنی دونوں ہتھیلیاں زور سے زانوؤں پر مارتے ہوئے حکیم رفیع سے مخاطب ہوئی۔

''ناس پیٹے! کیا غضب کر دیا؟

''یہ..... یہ میری بہو ہے حکیم۔ بیس سال ہو چکے اسے میری بہو بنے۔ دورے تو پچھلے دس بارہ برسوں سے پڑ رہے ہیں اور..... اور تم کہہ رہے ہو اس کا بیاہ.....''

میں نے دیکھا، جواب میں حکیم رفیع بھی کچھ بولے تھے۔ پر جب وہ مریضہ کی ساس سے مخاطب تھے اسی پل انصاری روڈ سے گزرتے کسی ٹرک کا ہارن بجا تھا جس کی وجہ سے حکیم صاحب کا جواب میں نہ سن سکا۔ پھر میں نے مریضہ کی ساس کی آواز سنی:

''ضیغم تو ساتھ ہے حکیم صاحب۔

''بس کر ناس پیٹے، بس بھی کر۔ برسوں سے حویلی کی عزت سنبھالے

ہوئے تھی پر.....آج .....

وہ شکوہ تھا، مایوسی تھی، درد تھا یا آزردگی؟ میں سمجھ ہی نہ سکا۔ حکیم رفیع نے دایاں ہاتھ اس خاتون کے سر پر رکھ کر کہا۔

''میں تمہاری شرافت اور.....تمہارے صبر کو سلام کرتا ہوں بی بی۔

اس کے بعد انہوں نے ایک مرتبہ پھر ملازم کو آواز دی۔ مطب سے باہر کھڑا نوکر اندر آیا تو اس سے ایک گلاس پانی منگوایا گیا۔ تازہ پانی کا گلاس مریضہ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ مریضہ کے میاں سے بولے:

''انہیں گاڑی میں بٹھانے کے بعد آپ میرے پاس آئیں گے۔

''آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم چلے جائیں گے۔ ضیغم کو دیکھیں آپ۔

ماں نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں انہیں مخاطب کیا تو خجل ضیغم سب سے نظریں چرائے، سر جھکائے چوکی پر بیٹھ گیا۔ اپنی طرف بڑھتے حکیم صاحب کے ہاتھ کو دیکھ کر اس نے دایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھانے کے لیے دوسرے ہاتھ سے اس کی آستین اوپر کی۔ حکیم رفیع نے اس کے ہاتھ، اس کی انگلیوں کو غور سے دیکھ کر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں نے دیکھا، حکیم صاحب ضیغم کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے مگر میرے کانوں میں کچھ دیر پہلے سنی ہوئی حکیم صاحب کی باتیں سرسرا رہی تھیں: کچھ سچ مستور ہی اچھے لگتے ہیں۔ ایک اور آواز کانوں میں سنسنائی.....''ناس پیٹے! کیا غضب کر دیا؟ .....بس کر، ناس پیٹے بس کر..... برسوں سے حویلی کی عزت سنبھالے ہوئے تھی.....

میرا جی چاہا، چیخ کر حکیم رفیع سے کہوں: معاشرے کو تاشے بجانے دیجیے.....دل آزاری ہوتی ہے تو ہوا کرے..... یہ بی بی بیس برسوں سے کون سا سچ چھپائے جی رہی ہے؟ اس میں کتنا ظلم ہے؟ پتہ تو چلے۔

''کہاں ہو بھئی؟ وہ تو چلے گئے۔ آؤ، بیٹھو۔

میں نے دیکھا: مطب، میں حکیم رفیع تھے، میں تھا اور کچھ آوازیں تھیں جو میں ہی سن رہا تھا۔ اپنا سر جھٹکتے ہوئے میں نے حکیم صاحب سے پوچھا:

''آپ نے ضیغم کے کان میں کیا کہا تھا؟

حکیم رفیع نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑنے کے بعد اپنی طرف کھینچتے ہوئے مسکرا کر بولے:

''بس یہی، جن کے گھر میں کنواں ہو.....''

حکیم رفیع کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے میں دیکھ رہا تھا، وہ کیا کہہ رہے تھے؟ مجھے اس لیے سنائی نہ دیا کہ انصاری روڈ پر سے گزرتے ٹرکوں کے ویکیوم ہارنز یکے بعد دیگرے چیخ رہے تھے۔

○○

کہی اَن کہی

''مجھے معلوم ہے۔ وہ دن کون سا ہے!
شیروانی میں ملبوس شخص نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
''سچ؟ سائل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
''ہاں مجھے معلوم ہے!
''تو پھر بتاؤ، برادرِ عزیز! مجھے.... انہیں، اُن سب کو، جہاں تک تمہاری

آواز پہنچے، خدا کے لیے بتا دو کہ یہ آگ ہمارا پیچھا چھوڑے، ہم عذابوں سے محفوظ رہیں اور.....اور نعمتیں ہم پہ اتریں۔

''افسوس میں..... میں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ جانتا ضرور ہوں اس دن کے بارے میں لیکن مانتا نہیں ہوں اس دن کی اہمیت کو!

''اے لوگو، اے لوگو!

——O——

شہر کے سب سے بڑے چوک کے درمیان کھڑے ہوکر اس نے آواز لگائی، مشینی شہر کے مشینوں کے پرزے سمان لوگ چلتے چلتے رکے، آواز لگانے والے پر ایک نظر ڈالی، کچھ آگے بڑھ گئے، بلا کسی ردعمل کا اظہار کیے، کسی کی پیشانی پہ سلوٹوں کا جال اُبھرا، کسی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا، کچھ قدرے توقف کے بعد سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن بیس پچیس افراد ادھر اُدھر اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ آواز لگانے والے نے گھوم کر چاروں طرف نظر دوڑائی، پھر کھنکار کر اس مختصر سے مجمع سے مخاطب ہوا:

''تمہیں کچھ پتہ ہے؟

''کا ہے کا؟

''اس دن کا۔

''اس دن کا..... بولے تو؟

پوچھنے والا حیران ہوا، پھر اس نے اپنے آس پاس کھڑے لوگوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، جواب میں سب نے لاعلمی میں شانے اُچکائے اور پھر اس نے بھی کندھے اُچکاتے ہوئے، آواز لگانے والے سائل سے پوچھا:

''کس دن کا؟

''افسوس..... تمہیں بھی نہیں معلوم۔

مایوسی سے اس نے سر جھکایا، پھر آہستہ سے بولا:

''قسم ہے اس زمین کی، اس کے باپ کی اور اس باپ کے پیدا کرنے والے کی۔ ہم سب گھاٹے میں ہیں۔

''گھاٹا!'' اور پھر تو چاروں طرف اسی ایک لفظ کا ورد ہونے لگا۔ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے، پھر اس بھیڑ میں شامل کسی آفس کے چپراسی نے سہمے سہمے لہجے میں آواز لگانے والے سے پوچھا:

''اپن کچھ بولے گا؟

آواز لگانے والے نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا، پھر سر کی خفیف سی حرکت سے اسے اجازت دے دی، چپراسی نے مسمسی سی صورت بنا کر کہا:

''اپنا کلیان ہو جائے گا۔ سچی بولتا ہوں۔ بہت واندے میں آ گیا ہوں، بس ایک پانا بتاؤ بابا اپنا....

پیون کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قہقہے ابل پڑے، قہقہوں کی آواز سنتے ہی ادھر ادھر سے کچھ لوگ بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ چپراسی نے خفگی اور خجالت سے مجمع کو دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا مجمع سے نکل گیا۔

''سچ کہتا ہوں، تم سب خسارے میں ہو، میری طرح، کیونکہ تمہیں بھی نہیں معلوم۔

''کیا نہیں معلوم؟ ایک سوٹ بوٹ والے جنٹل مین نے اس سے سوال کیا۔

''وہ دن، جس کا ہمیں علم نہیں۔

''کون سا دن؟ ہم تو بہت سے دنوں کو جانتے ہیں: ایسٹر، نیوایئر، ہولی، عید، بقرعید، پہ پے ٹی، کپور۔

''کون ہو تم.....؟

سوال کرنے والے نے کسی قدر کرخت لہجہ میں پوچھا:

''ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، کون ہو؟

''میں.... میں... میں پارسی ہوں۔

''تم سب غور سے سنو..... ہم نے غلط دنوں کو حافظے میں جگہ دے رکھی ہے۔ وہ دن اِن میں سے کوئی بھی نہیں۔ جاؤ، جاؤ مندر، مسجد، گرجا اور اگیاری میں اور پوچھو اس دن کے بارے میں جسے جان لینا بہت ضروری ہے۔

''تم جانتے ہو؟

اطمینان بھرے لہجے میں کسی نے اسی سے پوچھ لیا۔ اس نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی مولوی نما فرد تھا۔ ممکن ہے مولوی ہی رہا ہو، چھوٹی موری کا پاجامہ، اس پر شیروانی پہن رکھی تھی اور چہرے پر سیاہ داڑھی بھی تھی۔ خط تازہ بنا ہوا تھا۔

''تم نے کچھ کہا؟

''ہاں بھائی! میں نے پوچھا تھا، تم جانتے ہو اُس دن کو؟

''جانتا تو.... تم سے کیوں پوچھتا؟

''پر یہ تو بتاؤ.... تم کون ہو؟

''آدمی ہوں۔

''اچھا.... ابھی .... اس دُنیا میں آدمی رہتے ہیں؟

''کیوں؟

''سنا ہے اس زمین پر ہندو، مسلمان، یہودی، کرسچین اور دہریے رہتے ہیں۔

''آدمی دلچسپ ہو۔ چلو مان لیا..... میں آدمی نہیں، مسلمان ہوں، پھر؟

''پھر تو شاید تم میرا سوال حل کر سکو۔

''یہ اُمید کیوں؟

''اس لیے کہ مجھے یہ سوال قرآن سے ملا ہے۔

''کیا مطلب؟

''سوال کا پوچھتے ہو یا.....

''قرآن کو تم کیا سمجھے؟ سمجھے بھی یا.....

''ٹھیک کہتے ہو میرے بھائی! اسے سمجھنے کا حق صرف تمہارا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا: شاید تم میرا سوال حل کر دو۔ بتاؤ، وہ دن کون سا ہے جس دن کائنات کا پیدا کرنے والا تم سے راضی ہوا تھا اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں تمام کی تھیں۔ سنا ہے اس روز تمہارا دین بھی مکمل ہوا تھا۔

مولوی نما شخص کی آنکھوں میں حیرت کے سائے اُتر آئے، پیشانی پر شکنیں اُبھریں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اس سائل نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''جانتے ہو۔ اُس روز کس نے کہا تھا: آج کا اعلان تمہاری اپنی خواہش کا اظہار ہے، اللہ کا حکم نہیں، اور اگر تم نے وہی کہا ہے جو وہ چاہتا ہے تو میں اسے ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ وہ ہستی جو عالمین کے لیے رحمت قرار دی گئی خاموش تھی، انحراف کرنے والے نے کہا تھا: کہو اللہ سے مجھ پہ عذاب نازل کرے۔ اور..... اور تم جانتے ہو جس ہستی نے ہمیشہ آتے ہوئے عذاب لوٹائے اور دُعا کی: پالنے والے مجھے اتنا عزم عطا کر کہ میں انہیں سمجھا سکوں اور انہیں توفیق دے کہ یہ ہدایت پا جائیں۔ لیکن اس روز..... اس روز مجسم رحمت نے عذاب ٹالنے کی دُعا نہیں کی، اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور تپتی دوپہر میں، جھلستی ہوئی دھوپ میں کھڑے ہزاروں ہزار لوگوں نے دیکھا، انکار کرنے والے پر ایک کنکری گری اور وہ.... وہیں ڈھیر ہو گیا۔

وہ جس نے سائل کو چھیڑا تھا، پہلو بدلنے لگا، سائل سے نگاہیں ملانے کی اس میں ہمت نہ رہی، اس نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا، بھیڑ میں

ایک شخص اخبار لیے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں شاہ سرخی پر جم گئیں:

''اسرائیل نے غزہ میں اپنی خوں ریز کارروائی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے سلامتی کونسل کی تجویز مسترد کر دی۔

''امریکہ اور اس کے حواریں نے ایران پر پابندیوں کی سختی پر اصرار شروع کر دیا۔

''حکومت مہاراشٹر کے ٹال مٹول کے رویئے پر سپریم کورٹ کی سہ رکنی بنچ برہم۔

''جانتے ہو اُس دن کو، جس کا واقعہ میں نے بیان کیا؟

''بتاؤ ملاّ جی۔

''یہ آدمی ....یہ آدمی.....

شیروانی والے نے نظریں بچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن سائل اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

''میں..... پاگل ہوں، خبطی ہوں، یہی کہنا چاہتے ہو؟ یہ غلط ہے کہ میں پاگل ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں پاگل ہوتا جا رہا ہوں اور یقین کرو میرے بھائی!.....اگر یہی طور طریقے رہے تو ایک روز ہم سب...ہم سب.....

چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی چھائی، مولوی نما شخص نے مجمع سے نکل جانے کا ارادہ کیا تو سوال کرنے والے نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پلٹا، غصے سے اسے دیکھا اور حقارت بھرے انداز میں اس سے پوچھا:

''اب کیا چاہتے ہو؟

''اُس دن ....

''تاریخ کئی اہم دنوں سے بھری پڑی ہے۔

تب تو....تمہیں ضرور معلوم ہوگا۔ بتاؤ، خدا کے لیے، تاکہ میں پاگل ہونے

سے بچ جاؤں۔ بتاؤ، وہ کون سا دن تھا؟

''مگر یہ مسئلہ کیا ہے؟ تم دیکھ رہے ہو۔ ہم آگ میں جل رہے ہیں اور تم... اس دن کو تلاش کر رہے ہو۔

''اس آگ سے ہم کہاں تک بچ پائیں گے۔ یہ آگ برسوں پہلے خود ہم نے لگائی تھی۔ برسوں پہلے ہم نے کسی کا گھر جلایا تھا۔ کسی محترم خاتون کی پسلیاں توڑ دی تھیں اور پہلے قدم کی تسلیمی کے لیے چوتھی منزل پہ کمند ڈالی تھی..... یاد ہے؟ وہی آگ آج ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو اس دن کا پتہ چلاؤ جب نعمتیں ہم پہ نازل ہوئی تھیں۔

غیر ارادی طور پر مولوی نما شخص کی نظریں اسی اخبار کی شاہ سرخی پر مرکوز ہو گئیں، ساتھ ہی اس سے ملتی جلتی کئی خبریں اس کی سماعت سے ٹکرائیں جو نیوز بلیٹن میں سن کر ہی وہ گھر سے نکلا تھا۔

''مجھے معلوم ہے وہ دن کون سا ہے۔

شیروانی والے نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''سچ؟

سائل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔

''تو پھر بتاؤ۔ مجھے ....انہیں۔ ان سب کو..... جہاں تک تمہاری آواز پہنچے۔ خدا کے لیے بتا دو کہ یہ آگ ہمارا پیچھا چھوڑ دے، ہم عذابوں سے محفوظ رہیں اور.....اور نعمتیں ہم پر اُتریں۔

''افسوس.....

○○

کوند

جھیل میں اک ذرا سے وقفے سے دو آدمی کودے، ایک ہاؤس بوٹ میں سے اور دوسرا سڑک سے۔ شاہراہ سے کودنے والے نے ہاؤس بوٹ والے کو جھیل میں کودتے دیکھ لیا تھا، وہ اسے بچانے کے ارادے سے ہی قدرے توقف کے بعد کود گیا۔ غڑاپ، غڑاپ کی دو آوازوں نے سڑک پر، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تعینات باڈر سیکورٹی فورس کے جوانوں کو بھی چونکنے پر مجبور کر

دیا۔ ان میں دو نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، پتلیوں کی خفیف سی حرکت نے دونوں کو فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے اپنے اسلحے زمین پر رکھے اور پھر ایک کے بعد ایک دو آوازیں سناٹے کو توڑنے میں کامیاب ہوگئیں۔ فورس کے دیگر جوانوں نے دوڑکر پہلے تو بندوقوں پر قبضہ کیا، پھر ان کی آنکھوں میں سوال کے جگنو چمکے، مگر گرد ونواح کے سکوت نے اُنہیں کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے ہی نہ دیا۔ ان سب نے ایک ساتھ ہی کچھ کہا تھا، مگر اس آواز پر محکمہ پولس کی جپسی ماروتی کے انجن کا شور غالب آ گیا۔ اس سے پہلے کہ فورس کے جوان اپنے سروں کو حرکت دیتے انہوں نے جپسی میں سے انسپکٹر کو اُترتے دیکھا اور جب وہ جوانوں کے قریب پہنچا تو اس کی استفہامیہ نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے ایک جوان بولا:

''پہلے دو آدمیوں کے کودنے کی آوازیں سنائی دیں۔ فوراً ہی ہمارے دو ساتھی آگے پیچھے کود گئے۔

انسپکٹر نے جھیل کی سطح کو دیکھا۔ دائرے اب بھی پھیل رہے تھے۔ وہ آگے بڑھا۔ فورس کے جوان اس کے پیچھے ہولیے، انہوں نے دیکھا، جھیل کی سطح پر تواتر کے ساتھ بلبلے اُبھر رہے ہیں۔ ان کے پھوٹتے ہی دائرے بنتے ہیں اور وہ بڑی تیزی سے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان بلبلوں کی آوازوں پر کان لگائے اور پھیلتے ہوئے دائروں پر نظریں جمائے انسپکٹر سوچنے لگا: یہ جھیل تو اپنے شکاروں کی وجہ سے پہچانی جاتی رہی تھی۔ ٹورسٹ آیا کرتے تھے، ٹھہرے ہوئے پانی میں حرکت ہوتی، سطح پر دکھائی دینے والے پہاڑوں کا عکس ان کے اپنے حسن میں اضافہ کر دیا کرتا تھا، کیونکہ جھیل کی سطح پر آس پاس کے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے بوسے لیا کرتی تھی۔ فضا میں ہوا کی تال پر سیبوں کی مہک رقصاں ہوتی تھی۔ پر اب جھیل وہ جھیل نہیں رہی، اب تو یہاں سناٹا خوف سے سرگوشیاں

کرتا ہے یا فورس کے جوانوں کے جوتوں کی دھمک سنائی دیتی ہے اور..... ایک اور آواز بھی سنائی دیتی ہے..... دور سے..... پاس سے! گولیوں کی آواز۔

سطح کا پانی آواز کے ساتھ پھٹا، اس میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص ایک بے ہوش آدمی کو لے کر برآمد ہوا، ان سے قدرے فاصلہ پر دو اور آدمیوں نے سر نکالا تو فورس کے جوان خوشی سے اچھلے۔ دونوں تیرتے ہوئے ان دونوں کے پاس پہنچے، بے ہوش کو سنبھالا، انسپکٹر نے ایک جوان کی مدد سے سب کو باہر نکالا۔ باہر آتے ہی دونوں جوانوں نے سر کو جھٹکنا شروع کیا تو بوندیں ادھر اُدھر گرنے لگیں۔

''تم دونوں کو کیا سوجھی؟

''ہم نے کودنے کی آواز سنی، لگا کچھ گڑبڑ ہے۔

''ارے وہ تو ہے ہی، ورنہ ہم یہاں ہوتے۔

''وہ کون ہو سکتے ہیں؟ اُگروادی، آتنک وادی؟

فورس کے جوانوں نے جیپسی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تو ان کی نگاہیں گاڑی کے باہر کھڑے انسپکٹر پر پڑیں۔ وہ ان ہی سے مخاطب تھا:

''تم اس کی رپورٹ اپنے چیف سے کروگے۔ ان سے کہنا پولس ہیڈ کوارٹر میں انسپکٹر ملک سے ملیں۔

——O——

دونوں جوانوں نے اپنے افسر کے ساتھ پولس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر سارا واقعہ تحریری صورت میں داخل دفتر کیا، وہیں انسپکٹر ملک کی زبانی پتہ چلا کہ ان میں سے ایک غلام محمد کشمیری ہے۔

''دوسرا کون ہے؟

''کہتا تو وہ اپنے کو بھارتی ہے۔

''یعنی وہ.... کشمیری نہیں۔

''نہیں..... کشمیری تو نہیں ہے۔

''نام کیا ہے اس کا؟

''وبھوتی نرائن رائے۔

نام کو کئی بار زیرلب دہرانے کے بعد فورس کے افسر نے انسپکٹر سے کہا:

''اپنی کارروائی پوری کرنے کے بعد دونوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ باقی پوچھ تاچھ ہم کریں گے۔

''آپ کے آنے سے پہلے اس کشمیری کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ قالین مرچنٹ عبدالقادر نے اس کے بارے میں بیان دیا ہے کہ غلام محمد نے بھی قالین کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ کاروبار ترقی پر تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا فورس سے مڈبھیڑ میں اپنی جان سے گیا۔ عبدالقادر کا کہنا ہے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت نے غلام محمد کو کہیں کا نہ رکھا۔ اس کی بیوی، بیٹے کا غم لیے چل بسی۔ تب سے اب تک وہ گم صم رہا۔ کاروبار بھی ختم ہو گیا۔ مسلسل صدموں کے کارن ہی اس نے مرنے کی کوشش کی ہوگی۔

''اس کا بیٹا فورس سے بھڑنت میں مرا ہے..... نام کیا تھا اس کا؟

میز پر رکھی فائل کھول کر انسپکٹر نے عبدالقادر کا بیان پڑھ کر نام بتایا تو فورس کے افسر نے ذہن پر زور دیا پر اسے یاد نہ آیا کہ غلام محمد کا اکلوتا بیٹا نثار کب مارا گیا ہے؟ مگر اسے یہ ضرور یاد آیا کہ بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔ اس نے انسپکٹر کو مخاطب کیا:

''اور وہ دوسرا آدمی..... کیا نام بتایا تھا..... وبھوتی نرائن رائے..... وہ کیا کہتے ہیں؟

''اس کا کہنا ہے میں نے اسے جھیل میں کودتے دیکھا اور بچانے کی خاطر

میں نے چھلانگ لگائی تھی۔

''وہ کہاں سے آیا تھا؟

انسپکٹر ملک نے سوال سن کر پہلے تو ایک نگاہ افسر پر ڈالی پھر اس کے سوال کا جواب بھی دیا، مگر افسر کی آنکھوں میں بے یقینی کے سائے اسے نظر آ گئے تھے۔

——o——

بارڈر سیکورٹی فورس کا افسر، وبھوتی نرائن رائے کو اپنے دفتر لے آیا تھا اور اب وہ ایک کمرے میں اپنے ہم مرتبہ ساتھیوں کے ساتھ اسے گھیرے بیٹھا تھا۔

''تم نے انسپکٹر ملک کو بیان دیا ہے کہ تم کپوارہ گئے تھے۔

''میں گیا نہیں، لے جایا گیا تھا۔

''کشمیر کب آئے؟

''چند مہینے ہو چکے اور یہ بات بھی میں پولس کو بتا چکا ہوں۔

''ان سے تو تم نے یہ بھی کہا کہ تم ..... بھارتی ہو۔

''میں آپ کو بھی اپنا پتہ وہیں بتا چکا ہوں۔ اور اب پھر کہتا ہوں کہ میں بھارتی ہوں۔

''ہر پاکستانی جاسوس یہی کہتا ہے۔

ایک اور افسر نے اس کی بات سن کر قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں وبھوتی ہوں۔ وبھوتی نرائن رائے۔ نئی دہلی میں رہتا ہوں اور ساہتیہ سے سمبندھ ہے میرا۔

''ہوں۔ تھوڑی سی معلومات بھی ہو چکی ہے، تم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہو، اس کے رجسٹر میں وہی لکھا ہے جو تم بتا رہے ہو۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسپائی پوری تیاری کے بعد ہی اپنی جگہ چھوڑتا ہے۔

آفیسر کا چبھتا ہوا لہجہ وبھوتی کی مسکان کا باعث بن گیا، اس نے ایک ایک چہرے پر نگاہ ڈالی پھر اطمینان سے ان سے پوچھا:

''میں آپ لوگوں کو کیسے اطمینان دلا سکوں گا؟

جواب میں سارے افسران بھی مسکرانے لگے، پھر ان میں ایک نے اس سے کہا:

''تمہارے اطمینان دلانے ہی سے ہم مطمئن ہوں گے؟

''میں وبھوتی ہوں۔ اس کا وشواس آپ کو میرے وجود ہی سے تو ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے لیے مجھے اپنی پتلون بھی اُتارنی پڑ گئی۔

''سنتُشٹ تو ہم اب بھی نہیں۔ تم نے سنا نہیں، ہمارے ایک ساتھی نے ابھی ابھی کہا کہ جاسوس ہر پرکار کی تیاری کے بعد ہی جگہ چھوڑتا ہے۔

وبھوتی کے چہرے پر بیزاری کا ہلکا سا تاثر اُبھرا۔ فورس کے افسروں نے اسے دیکھا، اور اپنے اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کی۔

''وندے ماترم پڑھو گے؟

کچھ دیر بعد ان میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وشواس تو پھر بھی نہیں آئے گا آپ سب کو۔ اس لیے کہ آپ کے کہنے کے انوسار ایک جاسوس کا اسے یاد کرنا بھی ضروری ہوتا ہوگا.....

مسکراتے ہوئے وبھوتی نے جواب دیا اور یہ بھی اس نے دیکھا کہ ایک افسر غصہ میں کھڑا ہو گیا ہے۔

——O——

بارڈر سیکورٹی فورس کے جو افسران تفتیش کر رہے تھے انہیں وبھوتی نرائن رائے کی باتوں پر یقین تو آیا ہی نہیں تھا۔ ہاں انہوں نے اس سے متعلق تمام

رپورٹ افسران بالا تک ضرور پہنچائی۔ انہوں نے اس رپورٹ پر اپنے نوٹ لکھ کر مرکز کو بھیجا اور نئی دہلی سے تین افسران کو سری نگر پہنچنے میں پورے آٹھ روز لگ گئے تھے۔ انہوں نے رپورٹ کے مندرجات پر شہر میں انکوائری کروائی تھی۔ اس درمیان رپورٹ روانہ کرنے والوں نے انسپکٹر ملک کے تعاون سے عبدالقادر سے غلام محمد کے بارے میں معلومات حاصل کیں، عبدالقادر کے علاوہ بھی دس پندرہ کشمیریوں نے غلام محمد کے کشمیری ہونے کی تصدیق کر دی تھی اور انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ غلام محمد کا تعلق کسی علاحدگی پسند گروپ سے نہیں ہے۔ البتہ اس کا بیٹا نثار یقیناً بہک گیا تھا۔ وہ پہلے علاحدگی پسند حلقے میں شامل ہوا، پھر دہشت گرد بنا اور جلد ہی مارا گیا۔ لیکن وہ افسران وبھوتی نرائن رائے کی باتوں سے مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے رائے کے تمام دلائل سن لینے کے بعد جواب میں ایک ہی بات کہی کہ ساری تیاریاں مشن پر نکلنے سے پہلے ہر جاسوس کرتا ہی ہے۔ وبھوتی کے برجستہ تبصرہ پر اُن میں سے ایک غیظ کے عالم میں کھڑا بھی ہو گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ چھوڑتا وبھوتی نرائن رائے نے پتلون کی جیب میں سے بھیگا ہوا شناختی کارڈ نکال کر میز پر ڈال دیا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی افسر کا اُٹھا ہوا ہاتھ آہستہ سے اپنی جگہ پہنچا تھا اور پھر انہوں نے آپس میں مشورے کے بعد رپورٹ اوپر روانہ کردی۔ اس پر نوٹ لکھا گیا اور پھر وہ رپورٹ مرکزی حکومت کے محکمۂ داخلہ کو روانہ کردی گئی۔

پورے آٹھ روز بعد ایک بار پھر وبھوتی ان کے سامنے تھا۔ منسٹری سے بھیجے گئے تین افراد کے علاوہ بارڈر سکیورٹی فورس کا اعلیٰ افسر بھی اپنے جونیئرز کے ساتھ میز پر موجود تھا۔ اس نے منسٹری سے آئے ہوئے تینوں افسران کے اشارے پر بات شروع کی:

''سیکورٹی فورس کی رپورٹ ملنے کے بعد منسٹری کے انویسٹی گیشن سے یہ تو

معلوم ہو چکا کہ تم سچ کہہ رہے تھے، مگر ہماری سمجھ میں آج بھی یہ نہیں آ رہا ہے کہ تم کشمیر کیوں آئے تھے؟ تمہارے آنے کا **اُدیشیہ** کیا تھا۔

''میں..... ایک مشن پر آیا تھا۔

''مشن؟ یہاں کشمیر میں..... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے دُشمن کیا چاہتے ہیں؟ برابر سے آنے والوں کا مشن تو سمجھ میں آتا ہے۔ وہ..... وہ میاں ہیں اور... ہم.....

''سوال یہ نہیں کہ وہ میاں ہیں اور ہم میاں نہیں ہیں۔ انہیں تو وقت نے ایک پہچان دے دی ہے، مجھے پتہ نہیں اس آئیڈینٹی فکیشن میں ہمارا کنٹری بیوشن کیا ہے؟ اور صاحبان! بُرا نہ مانیں تو کہوں کہ ہم میں سے بہتوں کو آج بھی یہ نہیں معلوم ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ میاں کیا ہوتا ہے؟ اور سچ تو یہ ہے جناب! خود مسلمانوں کو بھی پتہ نہیں کہ ان میں کتنے میاں ہیں؟

''میاں..... مسلمان، مسٹر رائے، کیسی باتیں کرنے لگے آپ؟ ہمارے ہاتھ جو آتنک وادی لگے ان کا تعلق پاکستان اور افغانستان سے بھی ہے، اور وہ سب اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں۔

''میں نے کہا نا۔ مسلمان بھی نہیں جانتے کہ ان میں میاں بھائی کتنے ہیں؟ جو جانتے ہیں وہ چکی کے دو پاٹوں میں پسے جا رہے ہیں۔ یہ تو انٹرنیشنل پرابلم ہے..... اور ہماری سمسیا یہ ہے کہ ہم نے ہر میاں بھائی کو مسلمان سمجھ لیا ہے۔ ہمیں ان سے یعنی مسلمانوں سے شکایت ہے.... جب کہ ٹریجڈی یہ ہے کہ ہماری ہر اُنگلی بھی اپنی الگ پہچان چاہتی ہے۔ سیکولرازم کا نعرہ لگاتے ہوئے بھی ہم بھولتے ہیں کہ انگلیاں سکڑنے، سمٹنے اور مٹھی بن جانے کا ہنر جانتی ہیں۔ آپ کی فورس ہمارے تینوں محافظ اس آرٹ کو جانتے ہیں اور.....

''بھول رہے ہو مسٹر رائے! بہت سی انگلیوں کو یہ کلا نہیں آتی۔

مرکز سے آئے تین لوگوں میں سے ایک نے وبھوتی نرائن رائے کی بات کاٹی اور اپنا وِچار پرکٹ کیا تو رائے مسکرانے لگا۔ اس نے اس آدمی سے نظریں ملاتے ہوئے ملائمت سے دریافت کیا:

''آپ وہ کلا جانتے ہیں؟

''ہمیں اس کے جاننے کی کیا ضرورت ہے؟

سوال سن کر وبھوتی نرائن رائے نے ایک ایک چہرے کو پڑھنا شروع کیا۔ ہر چہرہ اس کے روبرو تھا۔

سارے اس کے جانے مانے تھے۔ مگر وبھوتی سوچ رہا تھا: ان میں سے کتنوں کو وہ جانتا ہے؟ جاننا تو رہا دور، وہ تو پہچانتا بھی نہیں۔ اسے تو مکھوٹے اتارنے کا ہنر بھی آتا ہے، اور جب بھی اس نے مکھوٹے اُتارے، اصل چہرے پر نظر ڈالی تو خود اس کی اپنی اُنگلیاں سمٹ گئیں۔

''تم کس مشن پر آئے تھے؟

بارڈر سکیورٹی فورس کے اعلیٰ افسر نے اس سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا:

''میں سروے کرنے آیا تھا..... وہاں سے منظر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''فاصلے پیدا کس نے کیے؟ ابھی کچھ دیر پہلے تم اُنگلیوں کی بات کررہے تھے۔ سمسیا تو یہی ہے نا کہ باقی کی اُنگلیاں بڑی کی بڑائی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

''میرا سوچنا کچھ اور ہی ہے صاحب! جو بڑی ہے۔ وہ تو ہے ہی بڑی۔ اپنے سے چھوٹی سے اپنی بڑائی کا اعتراف کیوں کرانا چاہتی ہے؟ اس پورے پرابلم میں جو اصل بات ہم نے بھلائی ہے وہ یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بھی ہتھیلی پہ جاکر بڑی سے ملی ہوئی ہے۔

وبھوتی کی بات کے ردعمل میں سب ہی نے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ انگلیوں کو پھیلا رہے تھے، سمیٹ رہے تھے۔

''کہتے تو...تم سچ ہو۔ سچ تو ان پنّوں میں بھی ہے جو تم نے ان پر لکھ دیا ہے مگر لوگ.... لوگ اسے جھوٹ مان رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ جھوٹ ہے۔ اب.....اب اس میں سچ تم کہاں بتاؤ گے؟

''جھوٹ میں سچ؟

''ہاں، جھوٹ میں سچ کہاں ہے؟

''ہے تو بھائی! جھوٹ میں سچ یہی ہے کہ وہ جھوٹ ہے اور یہ بھی سچ کے نام پر بولا اور لکھا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر جواب میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ وبھوتی نرائن دیکھتا ہے کہ ہال میں موجود ہر فرد ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے دیکھا منسٹری سے آنے والوں میں سے ایک نے پہلو بدلا اور اس سے مخاطب ہوا۔

''تم سروے کر چکے ہو۔ اب.....اب تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

وبھوتی نرائن رائے نے غور سے سوال کرنے والے کو دیکھا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا:

''سینتالیس میں جب دیش آزاد ہوا تھا، تب بھی کسی کشمیری نے بھارت سرکار کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے؟ اس سمئے کسی کشمیری نے آزاد کشمیر کا نعرہ لگایا تھا؟

○○

ہونی اَن ہونی

پون پل کی اَن ہونی پہ قدیم عمارتوں کی منزلیں، بالکنیاں، کمرے، دروازے اور کھڑکیاں ہی نہیں بلڈنگوں کے نیچے موجود دُکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے، کھڑے، ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونکتے دلّے بھی حیران تھے۔ معمولات کے مطابق گاڑیاں آ رہی تھیں۔ ہارن بجتے، ایک آدھ دلاّ گاڑی کی طرف بڑھتا پر اس کے بڑھتے قدموں میں اس کی اپنی ضرورت رَوبن کے آج نہیں دوڑ رہی

تھی۔ آج تو دلّوں کے اُٹھے قدموں سے ان کی ایڑیاں حیرت سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ سوال ان کے کان سن رہے تھے۔ ان کی دھمک ذہن کے کسی کونے میں دھم دھم کر رہی تھی۔ انڈیا آٹو پارٹس کے چبوترے پر بیٹھا سگریٹ پیتا، علاقے کا سب سے زیادہ تجربے کار دیوَث بھی سوچ رہا تھا: یہ کیسے ہو گیا؟ ماں کے یار کیسی کیسی تگڑ میں لگا نئی نئی چھوکریاں لاتے ہیں۔ وہ جن ٹھکانوں پر بکتی ہیں ہم سب وہاں بلائے جاتے ہیں۔ نئے مال کا نیا نام رکھا جاتا ہے۔ گھر والی ریٹ بتاتی ہے، ہمارا کمیشن طے ہوتا ہے۔ ہوم ڈلیوری کی قیمت بتائی جاتی ہے، ہوٹلوں میں سپلائی کے طریقے او روہاں کے خطروں سے بچنے کے گر بتائے جاتے ہیں اور ہم سب سوٗم سے سب سنتے رہتے ہیں کیونکہ چپ رہنے میں ہی اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ پھر پہلے تو روتے پھر بلکتے اور بعد میں سسکتے، سبکتے ٹیکسی چلنے لگتی ہے۔ ہر سال گھر والی صرف نوٹوں کا حساب ہی نہیں دیکھتی، کمرے میں موجود ٹیکسیوں کے پرزے بھی چیک کرتی ہے۔ کسی کے دو ایک نٹ بولٹ ڈھیلے ہونے پر ہم ہی میں سے کسی کو بھیج کر دوسرے کٹم خانوں کے ایجنٹ بلائے جاتے ہیں۔ پون پل کا جونا مال نچلی منزل پر اور وہاں سے تھوڑا اور پرانا ہونے پر فاکلینڈ روڈ اور کمائی پورہ پہنچ جاتا ہے۔ مگر یہ کہاں گئی؟ اور کیسے چلی گئی؟ بھڑووں کی حیرانی پہلے تو سرگوشیوں میں بولی پھر لَے ذرا تیز ہوئی تو اوپر کمروں میں موجود لڑکیوں کے دماغوں کی کسی رگ میں ہمت نے انگڑائی لی، اس کا اثر زبان پہ آنے لگا تو وہ مچلنے لگی۔

''ارے یہ سب کیسے ہو گیا یار؟ اس نے میڈم کو کیا گھول کر پلایا؟

''وہ بالو ہے نا بالو، وہ سالا بولتا ہے، ادھر پہلے کبھی ایسا ہوا ہی نہیں۔

''ارے تو بھی کس کی بات کرتی ہے، بالو ابھی نوا ہے۔ ادھر کا سب سے دِگج ایجنٹ اچھے ہے۔ پرسوں ہی وہ میرے کو بُک کیا ہوتا۔ ساتھ میں چھوڑنے جا

رہا تھا تو بول رہا تھا: ادھر ایسا بالکل پہلی بار ہوا ہے۔

''ارے ہم سب کس لیے ادھر کے سسٹم میں چکلّس کر رہے ہیں؟ چلو سب مل کر وہ میڈم کے پاس چلیں اور ان سے پوچھیں۔

''نہیں رے نہیں۔ پوچھ گچھ کے جھمیلے میں نہیں پڑنے کا، نیچے جو بھڑوے ہیں نا، وہ سالے کمیشن کا ہے کا لیتے؟

''تو سمجھی نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا ہم میڈم سے معلوم کریں۔

''گالیاں ملیں گی جواب میں۔ وہ ایسی ویسی میڈم نہیں ہے۔ پون پل کا پرانا ماڈل ہے۔ اپنی بائی ایک روز بول رہی تھی اس نے اپنے کو ایسا مین ٹین کیا ہے کہ آج تک ایک بھی بولٹ ڈھیلا نہیں ہوا ہے۔ جونے پرانے کرو لوگ آتے تو اسی کو حسرت سے دیکھتے ہیں، اور وہ میڈم آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے کہہ دیتی ہے: ابھی میں نے ترقی کر لی ہے، تم سب دوسروں کو پسند کرو..... اور سچ تو یہ ہے یار، وہ بہت ترقی کر چکی ہے، پورے ایریا کی بائی لوگ اسی کا حکم مانتے ہیں۔ تم سب فالتو میں دماغ خراب کر رہے ہو۔

''ارے! کیا بولتی ہے؟ ادھر جو کچھ بھی ہوا فالتو میں ہوا کیا؟ اس پر سوچ بچار بھی فالتو ہے۔

''نہیں تو کیا ہے؟ اس سے اپنا کیا ہوگا؟ چلو سب فٹا فٹ تیار ہو جاؤ۔ نیچے سے کبھی بھی کوئی بھی آ سکتا ہے۔

کمرے میں موجود سب سے پرانی والی نے تحکمانہ انداز میں مشورہ دیا تو اوروں کے دماغوں میں غٹرغوں کرتے سوالوں نے آنکھیں میچ گردنیں سیکٹر لیں۔

اردگرد کے کمروں سے کٹم خانوں کی وہ عورتیں بے ارادہ بالکنی میں نکل آئیں جن کی تحویل میں کئی کئی لڑکیاں تھیں۔ ان کے دل و دماغ میں بھی سوال

مچل رہے تھے۔ سب ہی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کیں۔ متحرک پتلیوں کو قرار آیا تو آگے پیچھے اس کمرے کی طرف بڑھ گئیں جہاں اَن ہونی ہوئی۔ سنسان کمرہ آنے والی عورتوں کے اطمینان کا باعث ہوا۔ انہوں نے سوچا چھوکریاں نہیں ہیں، اب اطمینان سے بات کی جاسکتی ہے۔ آرام کرسی پہ بیٹھی میڈم نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ جواب میں وہ سب بھی مسکرائیں۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کی زبان پر سوال آجائے میڈم نے خود ہی کہا۔

''جانتی ہوں۔ تم سب کیوں آئیں۔

''جانتی ہو تو بتا بھی دو بہن۔ چھوکریاں بول رہی ہیں، اپنا پورا علاقہ حیران ہے۔ ایسا ہوا کیسے؟ اور..... اور تم جیسی عورت نے برداشت کیسے کیا؟

آنے والی عورتوں میں سے ایک میڈم سے مخاطب ہوئی۔

''تو پھر کیا کرتی؟

میڈم نے مسکراتے ہوئے جواباً سوال کیا تو ایک ساتھ کئی آوازیں اُبھریں:

''اب ہم کیا بتائیں، ہمیں تو خود بھی معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟

میڈم نے ایک اک چہرہ غور سے دیکھا، ان پر موجود حیرانی کے گھٹتے بڑھتے سائے دیکھے اور پھر ان سے کہنے لگی:

''جو ہوا وہ تو ہوتے ہی رہتا ہے۔ پر اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ ادھر نہیں ہوتا۔ تم میں سے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہے۔ سچ بولوں تو..... مجھ میں بھی نہیں۔ بس، اس دن پتہ نہیں کدھر سے پھدک کر میرے دماغ میں گھس گئی۔ پھر مجھے لگا۔ وہ اوپر سے نیچے آرہی ہے۔ اِدھر.....

میڈم نے اپنی چھاتی کے بائیں حصے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہمت.....!

کسی نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ہمت۔ وہ رانڈ ہوتی تو ہم ادھر ہوتے ؟ پوری جوانی سالی ادھر ہی تو گزری ہے۔ وہ تو نصیب اچھا تھا، ہم سب کو کرسیاں مل گئیں اور اپنی جگہ نئی نئی لڑکیاں آ گئیں۔

''مگر وہ لڑکی ایسا کیا کر گئی بہن۔ اپنا تو پورا سسٹم ہی ہل گیا ہے اور تم نے بھی چپ سادھ رکھی ہے۔

'' کچھ بُرا کیا میں نے؟

پل بھر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پل کے ہر ہر حصے میں ان سب عورتوں نے اپنے آپ کو گزرے ہوئے کل کے آئینے میں پورم پور ننگا دیکھا تو ان میں سے ایک نے میڈم سے پوچھا:

''ادھر کچھ اچھا بھی ہوتا ہے کیا؟

جواب میں پھر سناٹا چھا گیا۔ سب نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ان سب ہی نے محسوس کیا، سوال کا جواب سب ہی کے پاس ہے۔ پر کوئی مجبوری انہیں بولنے سے روکے ہوئے ہے۔ سب کی آنکھوں کی پتلیاں تھرکنے لگیں۔ میڈم ان پتلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک عورت کی پتلیوں کی تھکن کا اندازہ لگایا تو اس سے بولی:

''ہوتا ہے۔ اور.....نہیں بھی ہوتا۔ ادھر یعنی اپنی دُنیا میں اور اُدھر بولے تو باہر کی دُنیا میں بھی۔ اچھا بھی ہے۔ بُرا بھی ہے۔ ہم ٹھہرے انگوٹھا چھاپ، شالا دیکھی نہ کالج، پن گیان ہمیں ادھر ملا ہے، اُس جگت میں نہیں۔

''گیان، جگت، شالا، ارے بائی تم کیا بتا رہی ہو؟

''ارے، میں کیا بتاؤں گی۔ اور کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چوپڑی کی ودّیا سے زیادہ گیان سڑک پر ہوتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھ ہے نا۔ یہ سالی

وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی جو سامنے موجود ہے۔ یہ وہ دیکھنا چاہتی ہے جس سے مزہ آجائے۔

''ارے بائی! کیسی باتیں کررہی ہوتم۔تمہاری طبیعت تو برابر ہے نا؟

'' یکھا کنھال گئے نا تم سب؟ مزہ نہیں مل رہا ہے۔ وہ سالا ملے گا بھی نہیں۔

'' تم تو عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔ گیان، جگت، شالا، چوپڑی، آنکھ، سامنے اے بہن اپنی تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا؟ سیدھے سیدھے کہو تو ہم بھی جان لیں کہ ہوا کیا؟

عورتوں میں سے جو اس سے مسلسل باتیں کررہی تھی اس نے پہلو بدلتے ہوئے میڈم سے کہا تو اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر اُبھرا۔ اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے عورت سے پوچھا۔

''ہم سب ادھر کس کی وجہ سے آئے ہیں۔ یہ نئی نئی چھوکریاں کون لاتا ہے؟

سب ہی عورتوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر ان سب نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر اُن میں سے ایک، میڈم سے مخاطب ہوئی:

''لانے والے بھی مرد اور اپنے گاہک بھی وہی ہیں۔

''سچ کہتی ہو۔ ادھر آنے والے پچاسوں مردوں کو دیکھا ہے تم نے، کچے پکے ہے نا؟ اب ذرا بتاؤ۔ جدھر سے آئی ہو اُدھر اور ادھر پون پل پہ سڑک پر ٹہلتے کتے بھی دیکھے؟

''بہت دیکھے ہیں۔لیکن تم.....

''دیکھ بہن! مجھے ادھر پون پل پہ آنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ آدمی اور کتے میں کچھ کچھ ملتا جلتا ہے۔

''کیا بول رہی ہو؟

کئی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میڈم نے مسکراتے ہوئے کہا:

''دیکھو ایک ہوتی وفاداری، وہ سالی دونوں میں ہوتی ہے۔ پن وہ بھی سالی اپنی طرح بکاؤ ہے۔ کتے کو اچھی اور زیادہ بوٹیاں ڈالو وہ وفاداری بدل دیتا ہے۔ پہلے جو اسے کم کھلا رہا تھا، کتا اُسے کاٹتا نہیں۔ اس کے پاؤں پر سر رگڑتا ہے اور شکایت کرتا ہے۔ لیکن آدمی سالا بڑا ہی خراب ہے، اس کے آگے گڈی والی ہڈی ڈالو، سالا اپنے باپ کو مار دیتا ہے۔ باپ، ماں، بہن، بیٹی۔ یہ کسی کو نہیں چھوڑتا۔ کتے کو دیکھو، جدھر کتیا دیکھتے ہیں، اپنا منہ اس کی دم کے نیچے لگا دیتے ہیں۔ ایسا ہی یہ سالے مرد بھی تو کرتے ہیں۔

میڈم دم لینے کو رکی تو اس نے دیکھا تمام عورتیں مسکرا رہی ہیں۔ لحظہ بھر کی خاطر اس نے کچھ سوچا اور پھر کہا:

''اچھا ہے۔ ہماری دم نہیں ہے۔ نہیں نہیں، ہے ہے۔ نیچے نہیں ہے اُوپر ہے لیکن اپنے میں اور کتیا میں صرف ٹانگ کا فرق ہے۔ لیکن سچ کہوں سالی کتّی بھی ہم سے ایک معاملے میں سرس ہے۔ وہ سالی پیٹ سے ہوتی ہے تو کتے کو قریب نہیں آنے دیتی، خوب چلاتی ہے۔ لیکن اپنی بولے تو عورت کی مجبوری ہے۔ مگر سالی مجبوری بھی تو مجبور ہے۔

میڈم دیکھ رہی تھی سب کے مسکراتے چہروں پہ موجود آنکھوں میں کچھ جان لینے کی خواہش مچل رہی ہے اور وہ آنکھیں اُس سے کہہ رہی ہیں کہ تم بھی کیا لے کر بیٹھ گئیں۔ ہم سب تو کچھ جان لینے کی خاطر آئے تھے۔ ہمارے نیچ شالا، ودّیا، جگت، آدمی، کتے، کتیا کیوں آ گئے؟ ہم تو یہ پوچھنے آئے تھے وہ لڑکی ایسا کیا کر گئی کہ تم ابھی تک چپ چھنال بنی بیٹھی ہو۔ کٹم خانے کی نائکہ میڈم نے ایک ایک چہرے پر براجے سوال کو دیکھا اور پھر اس

کے سامنے موجود حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا: میڈم کے ہونٹوں میں لرزش پیدا ہو چکی ہے۔

اس کے لرزتے ہونٹ تھے، ایک دوسرے سے پیوست ہوئے تو اس کے دل سے بخارات اٹھے۔ آنکھوں کے کٹورے بھرنے کے بعد چھلکنے کو تھے تب میڈم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پہ رکھ دیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا سر میڈم کی رانوں پہ رکھا ہوا تھا اور میڈم اس سے کہہ رہی تھی:

''تو، میں، ادھر تو جو بھی آتا ہے مجبور ہے۔ آنے والے کو بس اتنا معلوم ہوتا ہے وہ مجبور ہے۔ مجبوری کیا ہوتی ہے؟ سمجھنے کا ٹائم اس کو ملتا ہی کدھر ہے؟ وہ جو ہم کو خریدتے ہیں، سچ پوچھ تو وہ بھی مجبور ہوتے ہیں۔ انہوں نے، میں نے، تو نے اور ہم سب کے سمبندھیوں نے، مجبوری کی ایک ہی صورت دیکھی ہے۔ وہ بھی صرف اپنی مجبوری کی۔ تو مجھے صرف اتنا بتادے: تیرے کسٹمر تیرے سے راضی خوشی کیوں واپس نہیں ہوتے؟

میڈم کا موجودہ رویہ خود اسے عجیب لگا۔ اسے یاد آیا اپنا قصبہ ایلوور، جہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ لڑکیاں نیلام ہوتی ہیں، لڑکیاں ہی نہیں، عورتیں بھی۔ تیرہ چودہ برس کی لڑکیوں سے لے کر پچیس تیس برس کی عورتیں بھی بیچی جاتی ہیں۔ بولی لگتی ہے۔ پانچ ہزار سے شروع ہوتی ہے۔ اچھے ناک نقشے والی تندرست لڑکی یا عورت تیس ہزار تک بک جاتی ہے۔ خریدار اسے سال بھر تصرف کے بعد جسم فروشی پر مجبور کرتا ہے۔ ایلوور سے پون پل تک کی روداد وہ میڈم کو آج تک نہیں سنا پائی تھی کہ خریدار کے سامنے اسی میڈم نے اس کے بھرے بھرے کولہوں کو تھپتھپانے اور بھری ہوئی چھاتیوں کو ٹٹولنے کے بعد ہی تو نوٹوں کا ایک بنڈل خریدار کی طرف بڑھایا تھا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی تب سے آج تک روز ہی دو چار گاہک آیا کرتے، نوٹ میڈم کے سپرد کیے جاتے اور بخشش

کے دوچار اس کے بلاوز میں ٹھونسے جاتے۔ گاہک کیا بھری ہوئی بوتلیں ہوا کرتی تھیں۔ ہلی ڈلی اور چھلک پڑیں۔ کبھی کوئی باتونی اور طرّار بھی آجاتا۔ ایسوں کے ساتھ باتیں بھی ہوجایا کرتی تھیں اور کبھی باتوں میں مزہ بھی آتا تھا۔ دو چار بوسوں کی منزلوں سے گزرنے کے بعد گاہک کہتا:

''اے! بلاؤز کا ہک ہائی میں سے نکال۔

''ہائی کے چکر میں کیوں پڑتے؟

''ارے سمجھ نا!

گاہک اصرار کرتا تو میں مسکراتے ہوئے اس سے پوچھتی:

'' پکچر وکچر نہیں دیکھتے کیا؟

''دیکھتا ہوں۔ لیکن اُدھر تو خالی فوٹو نظر آتا ہے۔ تم ہائی کھولو ہائی۔

''کھائی میں ہو، اور ہائی کی بات کررہے ہو، ہلکے ہولو۔ دوسرا کوئی باہر انتظار کررہا ہوگا۔

سر سہلاتے ہوئے میڈم کا ہاتھ اس کی کمر پر پہنچا تو اس نے زانوؤں سے سر اُٹھانے کے بعد میڈم کو بے چارگی سے دیکھا۔ میڈم نے اس کی کمر سہلاتے ہوئے کہا:

''گاہکوں کے ساتھ ایسا کیا کچھ کرنے لگی ہے کہ وہ سالے منھ بنا کر واپس جاتے ہیں۔ کوئی کوئی گالی بھی دیتا ہے۔

''جو کچھ ادھر ہوتا وہی میں بھی تو کرتی ہوں۔ بس پچھلے تین چار برسوں میں تب چھٹی ہوئی جب میں نے مجبوری بتائی اور تم اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے گئیں بولے تو' صفائی کے واسطے۔

''ارے میں اس ٹائم کی نہیں آج کل کی بات کررہی ہوں۔ ابھی دو روز پہلے ایک چکنا چھوکرا آیا تھا۔ وہ سالا تیرے ساتھ میرے کو بھی گالیاں دیتے

ہوئے گیا تھا۔تو نے اس کے سنگ کیا کیا؟

اسے بہت کچھ یاد آتا چلا گیا۔ پہلے تو وہ ڈر گئی کہ اگر میں نے سچ سچ بتایا تو ہنگامہ ہو جائے گا مگر جوں ہی میڈم کا بدلا ہوا رویہ اسے یاد آیا تو اس نے میڈم سے کہا:

''جو کچھ میں نے کیا کیوں کیا؟ مجھے بھی معلوم نہیں۔ جو بھی ہوا بس ہو گیا۔

''پر ہوا کیا؟

''دیکھو میڈم! پہلے دو ٹائم مہینہ نہیں آیا تو میں نے تم سے کہا اور تم نے صفائی کرائی۔ اس بار میں نے تم سے چھپایا، آخری وقت بھی تم سے ذرا دیر میں ہی بتایا تھا۔ اس سے تھوڑا اچھا لگا تھا۔ اب چھپائی تو میرے کو بہت اچھا لگا۔ مرغی کا چھوٹا سا بچہ ہاتھ میں لیا کبھی تم نے؟

سوال نہ تھا سنسناہٹ تھی جو میڈم کی رگوں میں سنسنا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی اس کے سامنے جوان لڑکی نہیں ایک چھوٹا سا چوزہ ہے۔ اس کے ہاتھ لڑکی کی کمر سے ہٹے، کہنیاں ذرا سی مڑیں اور دونوں ہتھیلیوں میں اس لڑکی کا چہرہ سمایا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایک جانا پہچانا لمس دوڑنے لگا۔ اس نے اپنی پلکیں موندیں۔

''وہ بھی دوسروں کی طرح لنگر ڈال مجھے چوم چاٹ رہا تھا پھر وہ بھی بلاؤز ہک اور ہائی کھولنے کی ضد کرنے لگا تو میں نے بھی بلاؤز کا ہک ہائی میں سے نکال دیا اور.....اور۔

میڈم نے پلکوں کے پٹ کھولے، دیکھا، لڑکی کے ہونٹ لرز رہے ہیں اور اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس نے لڑکی کی کمر تھپتھپاتے ہوئے ملائم لہجے میں کہا:

''گھبراؤ مت، مجھے بتا دو۔

لڑکی کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر نگاہ پڑتے ہی میڈم نے جان لیا جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے۔ میرے ڈر کے کارن نہیں کہہ پا رہی ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی۔ دائیں بائیں شانوں سے ہوتے ہوئے اس کی ہتھیلیوں نے لڑکی کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لیا اور خود بھی کرسی سے اُٹھ گئی۔ لڑکی نے حسرت و یاس سے اسے دیکھتے ہوئے کہا:

''میڈم۔ اب ادھر ایسا لگتا ہے کچھ چل رہا ہے۔ میرے..... میرے ہونٹ دیکھو۔ کیسے ہلتے۔ ایسا ہی ادھر بھی ہوتا ہے۔

لڑکی نے جھکے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں سے پستانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس دن گاہک کے کہنے پر میں نے بلاؤز کھولا، برا ہٹایا تو وہ..... خوش ہو گیا۔ کچھ زیادہ مست ہوا تو میں نے اس کو اپنے سے لپٹانے کے بعد اس کے منہ میں.....

باقی بات اس کے حلق میں ہی پھنس گئی اور اس پل میڈم نے محسوس کیا کہ اس کی اپنی چھاتیاں تڑ رہی ہیں۔

''سب چکر پیٹ کا ہے۔ وہ بابو ہے نا بابو۔ وہ میرے پاس چھوکریاں لاتا ہے۔ وہ بھی بولتا ہم سب پیٹ کے واسطے یہ سب کرتے۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ ادھر آنے سے پہلے ہم سب جہاں تھے کچھ نہ کچھ کھا ہی رہے تھے۔ وہ حرامی جو ہمیں یہاں بیچ گئے، وہ بھی کھا رہے تھے۔ بہت سارا اور اچھا کھانے کا رزلٹ کیا ہوتا ہے بہن؟ سارا کھایا ہوا گو بنتا ہے۔

''گو تو ہم بن ہی چکے ہیں۔ میں نے بس ایک کام کیا ہے۔ اس کو اپنے ساتھ لے کر یہاں سے نکلی۔ اس کے ساتھ اس کے گاؤں گئی۔ اس بھڑوے سے

ملی اور اس سے کہا: اسے ماں بن جانے دے۔ اس لڑکی سے کہا: پیدا ہونے والے بچے کو نہیں بتانا، باپ کون حرامی ہے.....

تمام عورتیں بڑی توجہ سے سن رہی تھیں۔ میڈم کچھ کہہ رہی تھی۔ پر اُن میں سے کسی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، بس میڈم کے لرزتے ہوئے ہونٹ دکھائی دے رہے تھے۔

○○

سچ مُچ

شانوں پہ دھری ہنڈیا میں خیال کو پکتے ہوئے عرصہ بیت چکا ہے، تہہ میں سنسناتے مہین بلبلے بخارات کی شکل میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی نیم دائروی صورت میں اُٹھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہنڈیا کا مالک سوچتا ہے کھدکی پڑے تو جم کر بیٹھوں، لیکن کھدبد ہی نہیں ہو رہی ہے۔ کاغذ، قلم میز پر موجود ہیں پر اُبال ہی نہیں آتا۔ دونوں بنیادی کردار اپنے فطری صفات کے ساتھ کب سے خیال

میں بھیگے پڑے ہیں، کھچڑی ہے کہ پکنے کو ہی تیار نہیں ہوتی۔ ہوگی بھی کیوں؟ کھدکی پڑے تو بات بنے۔ یوں نہ کروں؟ آنچ تیز کر دوں، نہیں نہیں، پھر تو لوگ آسانی سے کہہ دیں گے کہ جلی جلائی پکائی ہے۔ ہر دانہ سوزش کی شکایت کرے گا۔ پکنے ہی دوں انہیں، فلک اور گیتی جا کہاں رہے ہیں؟ پڑے ہی تو ہیں۔ پر وہ تو کچھ کہہ بھی رہے ہیں:

''مجھے بچھایا کس لیے گیا ہے؟

''یہ تم کس سے پوچھ رہی ہو؟

''تم سے۔ مجھے تم عزیز ہو کیونکہ میرے سارے وجود پر چھائے ہوئے ہو۔ لیکن تم مجھ سے اتنی دور کیوں ہو؟

''ہمارے بیچ جو فاصلہ ہے، وہی تو ہمارا قرب ہے۔

''کاش فاصلے سمٹیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے، تم مجھے دبوچ لو۔

''خواہش تو میرے دل میں بھی مچلتی ہے، پر یہاں سے جو کچھ مجھے نظر آتا ہے، کاش اسے تم بھی دیکھ سکو۔

''ایسا کیا دکھائی دے جاتا ہے؟

''دیکھتا ہوں تم پہ بسنے والے عام اور خاص حد تو یہ ہے کہ گیانی دیانی بھی اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد ان سے منہ موڑ لیتے ہیں جو ان کی لازمی ضرورت ہے۔

''ضرورت؟

''ہاں ضرورت ہے۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟

چھوٹے اور ہلکے سے بلبلے بنے اور بخارات کے بادل کی طرف منہ کھول دیا۔ پک پک پھک پھک، پہلے سنسناہٹ کے عالم میں مہین سے تھے، اب چھوٹے ہوئے تو دو چار تھے اور پل کے پل ہزار تھے یا لاکھ؟ شمار کروں تو کیسے؟

کھد بد شروع ہو چکی تھی، اس نے قلم اُٹھا لیا۔

''ہم آج تک باتیں ہی تو کرتے آئے ہیں۔ دیکھو نا تم نے آج تک سوچا کہ تم بچھائی کیوں گئی ہو؟

''تم نے سوچا، تم مجھ پہ کیوں چھائے ہوئے ہو؟

''اس سے حاصل بھی کیا ہوگا؟ میں جتنا جانتا ہوں اسی پر، اس کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہہ بھی کیسے سکوں گا جس کے متعلق میں خود بھی کچھ نہیں جانتا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو کچھ بھی تم جانتے ہو وہ ادھورا ہے۔

''پتہ نہیں۔

''کیا مطلب؟

بلبلے کچھ بڑے ہو چلے تو اس نے میز کے بائیں کونے پہ رکھی چائے کی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگائی، پھکتی ہوئی چائے سے اُٹھتی بھاپ، بے خیالی کی نذر ہونے کے باعث اس کے ہونٹ جلا گئی تو اس نے زبان باہر نکال کر پہلے بالائی ہونٹ پر پھیری، پھر دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں اور اس کے بعد نچلے ہونٹ کی باری آئی۔ جس لحظہ وہ نچلے ہونٹ پر زبان پھیر رہا تھا تب اس کے ذہن میں سوال نے سر اُبھارا: میری طرح ان کے ہونٹ بھی تو جلتے ہوں گے جن کے بارے میں میری برادری کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی نرم سی نازک سی ملائم سی جنبش گردش ایام کی تلخی بدل دیا کرتی ہے۔ کاش دوڑتی بھاگتی زندگی کی مصروفیات کا کوئی لمحہ اس منظر کو بھی نظروں کے دائرے میں محصور کرتا جب کسی کے لب اسی طرح چائے سے جلتے دیکھتا تو ان کی اپنی زبان پہلے کس پہ جاتی ہے؟ جاتی کس پہ یار! اوپری ہونٹ ہی تو چائے سے جلا کرتا ہے، نچلے کو تو ظرف کی گرمی جلاتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جلنا دونوں کا.....

''مطلب تو یہ ہوا کہ جو کچھ تم جانتے ہو وہ پورا نہیں ہے۔

''پتہ نہیں۔

''کیا مطلب؟

''مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟ تم پر تو بڑے بڑے گیانی اپنی دانش کی نوبتیں بجاتے ہیں۔ ان سے معلوم کرو۔

''گیانی۔ ہنھ۔

''ارے ارے! تم ان کی تذلیل کر رہی ہو۔

''اور کروں بھی کیا؟ لمبی لمبی چوڑی چوڑی امیدیں رکھنے والے ہیں یہ سب، ان کے دل ان کے سینوں میں نہیں، زبان کے نیچے ہوتے ہیں۔

''انہیں گیان یوں ہی مل جاتا ہے۔

''مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، پڑے پڑے کیا کیا دیکھوں؟ کس کس بات پر آنسو بہاؤں؟ تم ہی بتاؤ، تم تو سارا تماشہ اطمینان سے دیکھتے رہتے ہو۔

''اطمینان سے تو نہیں دیکھتا کیونکہ دیکھنا میری مجبوری ہے۔ مجبور تو تم بھی ہو۔ تمہارا دل بھی ٹوٹتا ہے، تمہارے ہونٹوں سے بھی آہیں نکلتی ہیں۔ میں انہیں اپنی تحویل میں لے لیا کرتا ہوں، پھر لوٹا بھی دیتا ہوں۔ جب دیکھتا ہوں تمہارا حسن متاثر ہو رہا ہے، تم پر بسنے والے پریشان ہو رہے ہیں۔

''میرا اس قدر خیال رکھتے ہو، اتنا فاصلہ ہونے پر بھی؟

''فاصلہ ہے شاید اسی لیے۔ قربت ہوتی تو ممکن ہے خیال نہ رہتا۔

سمند خیال منہ زور ہوتا جا رہا تھا، بلبلے بنتے، پھوٹتے، ظرف کی حدوں سے اُبلتے، آنچ کو متاثر کرتے جا رہے تھے کہ جانی پہچانی معصوم آوازوں کی بارش نے سن سے آنچ کو خاموش کر دیا۔ یہ نومی کی آواز تھی۔ حنان اور کائنات کی آوازیں تھیں۔ نواسہ، نواسی۔ کس قدر حسین اور خوش گوار اتفاق ہے کہ تینوں بہنیں

ساتھ آئی ہیں۔ بیٹیوں اور بچوں کی مشترکہ آوازوں کا رِدَم کانوں کو بھلا لگ رہا ہے۔ اس روم پر اس کے پیر نہیں اس کا روم روم متحرک تھا کہ بیوی کی بلند آواز اس نے سنی۔ وہ بچوں کو اس تک نہ پہنچنے کی تاکید کر رہی تھی۔ لڑکیوں نے ماں کی تائید میں اپنے بچوں کو سمجھایا تو تینوں نے ان کی نہ سنی۔ دروازہ کھلا، تینوں ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ آداب کی پھوار پڑی، وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوا تو تینوں اس سے لپٹ گئے۔ نومی نے کہا:

''ممی کہہ رہی تھیں آپ لکھ رہے ہیں۔

جواباً مسکراتے ہوئے اس نے نواسے کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا گال تھپتھپا دیا۔

''کہانی..... لکھی بھی جاتی ہے نانو؟

اثبات میں مُندی پلکیں دیکھنے کے بعد نومی نے معصومیت سے کہا۔

''کمال ہے۔ ہمیں تو کہانی سنائی جاتی ہے یا پھر دکھائی جاتی ہے۔

''تمہیں مزہ کس میں آتا ہے۔

اُس نے نومی سے پوچھا تو جواب میں کائنات نے کہا:

''سننے میں بہت مزہ آتا ہے نانا۔

''دیکھنے میں نہیں؟

جواب میں کائنات اور حنان نے نفی میں کئی بار سر ہلا دیے اور حنان بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی:

''بور کرتے ہیں سب نانو۔ دو سین دکھاتے ہیں پھر دس دس بارہ بارہ ایڈس۔ بجلی کا بل بھریں، کیبل والے کو پے کریں اور دیکھیں تو کیا؟ گنے چنے سین۔

''نانو، آپ سب بھی ایسے ہی لکھتے ہیں۔

''سب تو نہیں..... مگر ایک آدھ نے شروع کر دیا ہے۔

''کون اسپانسر کرتا ہے ان کو؟

کائنات کے پوچھنے پر اس نے غور سے نواسی کو دیکھا اور سوچنے لگا اسپانسر شپ کیا ہوتی ہے۔ یہ تو ابھی اس کی ماں بھی نہیں جانتی۔ کاسموپولیٹن سٹی میں زندگی گزارتی اس کی نانی کو بھی پتہ نہیں ہے۔ لیکن کائنات کا سوال یہ بتا رہا ہے کہ اسے بہت کچھ معلوم ہے۔ اس نے ایک نظر کائنات پر ڈالی پھر کنکھیوں سے میز پہ رکھے کاغذوں کو دیکھا اور سوچنے لگا: اس بچی کی معصومیت کہاں چھپی ہے؟

''نانا! آج کہانی میں سناؤں گی۔

کائنات نے اس سے کہا تو حنان نے پہلو بدل کر پہلے تو اسے دیکھا پھر اسے کہنی مار کر بولی:

''نہیں پہلے میں سناؤں گی۔

''تو کیسے سنائے گی، تو نے کہانیاں ہی کتنی سنی ہیں؟

''سنی بھی، پڑھی بھی اور سال چھ مہینے میں دیکھی بھی ہے۔

''ابھی چھوٹی ہے حنو۔

''تو کیا ہوا؟ اس میں میری غلطی تو نہیں ہے۔

''ارے! تم دونوں لڑ کیوں رہی ہو؟

ان دونوں سے چھوٹے نومی نے بہنوں کو روکا اور ان سے مخاطب ہوا:

''ایسا کرو، فیصلہ نانو پر چھوڑ دو۔

کائنات اور حنان نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر منہ بناتے ہوئے نومی پہ نظر ڈالنے کے بعد ان کی سوالیہ نظریں نانا پر پڑ گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

''تم سب ابھی تو آئے ہو، جاؤ پہلے فریش ہولو، چائے پیو۔ اپنی نانی اور چھوٹی آنٹی سے باتیں کرو، رات ہوگی تب فیصلہ ہوگا کہ کہانی کون سنائے۔

رات ہونے پر نانا نے فیصلہ نواسے کے حق میں سنایا تو دونوں نواسیوں

کے منہ بن گئے۔ نومی نے بہنوں کے چہرے دیکھے تو ہنستے ہوئے بولا:
''میں اپنی باری ووڈرا کرتا ہوں اور کائنات باجی کو اناؤنس کرتا ہوں۔ حنان باجی! تم بعد میں۔

''میں تو پیدا بھی بعد میں ہوئی۔

نانا غور سے نواسیوں کو دیکھتا ہے۔ ایک کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور دوسری جواب دینے کے بعد بھی نتھنوں سے سانس لینے کے بعد منہ سے ہوا خارج کر رہی تھی۔

''سناؤں نانا۔

مسکراتا ہوا معصوم سوال اور جواب میں ہلتی نانا کی گردن دیکھتے ہوئے نومی پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا۔ حنان نے بایاں گھٹنا موڑا اور پہلو بدل کے گاؤ تکیے سے کمر ٹیک کر بالائی جسم کا بوجھ کہنی پہ ڈال کے بیٹھ گئی۔ کائنات نے مسکراتے ہوئے سب کو دیکھا اور کہانی شروع کر دی:

''ایک ایمان دار سپاہی تھا۔ وہ جدھر بھی ڈیوٹی پہ جاتا، ہے نا۔ اس کے ساتھی، ہے نا اس کی ٹنگل اڑاتے۔ ٹنگل معلوم نانا؟

''ارے باجی کہانی سناؤ کہانی۔ نانو کو ایڑا سمجھتی ہو کیا؟

حنان نے بہن کو ٹوکا تو نومی اور نانا مسکرا دیے اور کائنات نے اپنے نانا سے پوچھا:

''میں کچھ پوچھی نانا؟

''ارے بھئی ٹنگل کیا ہوتا ہے، ایڑا کسے کہتے ہیں مجھے معلوم بھی ہے اور نہیں بھی۔ تم کہانی سناؤ۔

''ہاں تو میں بولی اس کے ساتھی اس کی ٹنگل اُڑاتے، ہے نا جیسا وہ تھا نا، ویسی اس کی عورت بھی تھی۔ اپنی پولس کی نوکری میں ہے نا، وہ جدھر بھی گیا بس ویسا ہی رہا۔ اپنی پگار میں مست رہا۔ پھر کیا ہوا معلوم؟ ریٹائر ہوا نا تو اسے معلوم

ہوا کہ شہر میں مکان نہیں مل سکتا۔ جو روپے اسے ملے تھے ہے نا، وہ اتنے نہیں تھے کہ مکان خریدا جا سکے۔ وہ تھوڑے دن سوچ سوچ کر چپ چپ رہنے لگا تو کیا ہوا، معلوم؟ اس کی بیوی ہے نا، وہ اس سے بولی: سارے پیسے بینک میں ڈال دو۔ بس اتنے اپنے پاس رکھو کہ ہم ایک بھینس خریدیں۔ گاؤں میں اپنا گھر ہے۔ اُدھر رہیں گے، تم، میں اور بھینس۔ بھینس کا دُودھ تم حلوائی کو بیچنا، تھوڑا سا ہم بھی پی لیا کریں گے۔ سپاہی کو ہے نا، وائف کا آئیڈیا بھایا۔ گاؤں لوٹتے ہوئے ہے نا۔ اس نے بھینس بھی خریدی۔ دونوں بھینس لے کر گاؤں جا رہے تھے تو کیا ہوا معلوم؟ سورج ڈوب گیا، ہے نا پھر کیا ہوا معلوم؟ انہوں نے دیکھا قریب ہی ایک بستی ہے۔ وہ تیزی سے وہاں پہنچے۔ کھیت سے ملے ہوئے مکان مالک کا دروازہ کھٹکھٹایا، اپنی مجبوری بتائی اور رات کو ٹھہرنے کو کہا تو اس نے کہا: میرا گھر تو چھوٹا سا ہے۔ ایک ہی کمرہ ہے۔ تم باہر پڑ سکو تو رہ جاؤ، پر مجھے اس کا کرایہ کیا دو گے؟ سپاہی پہلے تو حیران ہوا پھر بیوی کے سمجھانے پر کرایہ طے کیا۔ راستے سے خریدی کچوریاں کھائیں اور بھینس دروازہ کے برابر دیوار میں موجود کونڈل سے باندھی۔ صبح ہوئی تو مکان کے مالک اور اس کی بیوی نے ان دونوں کو ناشتہ کرایا، پھر کیا ہوا؟ معلوم؟ کرایہ دیتے ہوئے ان دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ پتہ ہے کیوں؟ بات یہ ہوئی کہ مالک مکان نے اس سے کہا: تم نے میری اجازت کے بغیر بھینس دروازے پر باندھی۔ وہ رسی توڑ، میرے کھیت چر جاتی تو میرا نقصان ہوتا۔ اس لیے ہے نا، تم رات گزارنے کے کرائے کے علاوہ میرے نقصان کے پیسے بھی دو۔ سپاہی اور اس کی جورو کی ہائے ہائے پر پبلک جمع ہوگئی، ہے نا۔ پھر کیا ہوا معلوم؟ بستی کے پنچ بلائے گئے۔ انہوں نے سارا ماجرا سنا اور فیصلہ سپاہی کے خلاف ہوا۔ ان کا فیصلہ سن سپاہی حیران، بیوی پریشان کہ ہم کس بستی میں آن ٹھہرے۔ پنچوں کے فیصلے پر اس نے روپے دیے، بیوی اور بھینس کو لے کر اپنے

گھر پہنچا۔ دو چار روز گھر پر ریسٹ کرنے کے بعد کیا ہوا معلوم؟ وہ ہے نا سپاہی، بھیس بدل کر مزدور کے حلیے میں اس بستی جا پہنچا۔ اسے ان ہی پنچوں میں سے ایک کے ہاں کام بھی مل گیا۔ تھوڑے سے پیسے، روز چار روٹیاں اور دو پیازیں اس کی مزدوری ٹھہری۔ نقدی مہینے کے آخر میں ملنی طے ہوئی۔ مہینہ پورا ہوا، وہ تنخواہ لینے منشی کے پاس پہنچا تو ہے نا اس دن بھی اتفاق سے سارے پنچ وہیں جمع تھے۔ منشی نے ہے نا رقم گن کر اس کے سامنے رکھی تو کیا ہوا معلوم؟ وہ چلا چلا کر کہنے لگا: اتنے روپے اگر میں مہاجن کے پاس رکھواتا تو وہ مجھے ان پر سود بھی دیتا۔ پھر چار روٹیاں گیہوں کی طے ہوئی تھیں۔ اور مجھے باجرے کی یا مکے کی کھلائی گئی ہیں۔ انہیں کھانے کے بعد اگر میں بیمار ہو جاتا تو مجھے ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑتا۔ وہ میرا پیشاب، میرا خون ، میرا تھوک، میرا ٹول لے کر چیک کرواتے، اس لیے مجھے اور روپے دو۔ ہنگامہ ہوا۔ ہے نا پھر کیا ہوا؟ سب اس کے پاس چلے آئے تو وہ ان سے کہنے لگا: آپ لوگ پہلے بھی فیصلہ کر چکے ہو اب پھر انصاف کرو۔ صاحبو! پھر کیا ہوا معلوم؟ فیصلہ مالک کے خلاف ہوا۔ سپاہی نے جتنے پیسے پہلے کھوئے تھے اس سے زیادہ پائے۔ گھر پہنچ کر اس نے بیوی سے ساری بات بتائی۔ ایک بار پھر بیوی پریشان ہوئی۔ اس نے اپنے آدمی سے پوچھا: کیسی بستی ہے، کیسے لوگ ہیں اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ سپاہی کیا بولا معلوم ہے؟

نانا صرف مسکرا دیتا ہے، حنان کے ہونٹ بائیں طرف کو کھنچتے ہیں۔ کائنات کی نگاہیں نانا کے چہرے کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ نومی بہن سے بولا:

"جواب کیا دیتا باجی؟ پہلے تو وہ ہنسا ہوگا، نہیں تو مسکرایا ہوگا اور پھر بولا ہوگا: اپنی ہی دھرتی پر کھڑے ہیں بھاگوان۔

"سچ مچ، اس نے یہی کہا تھا۔ پر تجھے کیسے معلوم؟

اس نے دیکھا نومی سے باتیں کرتے ہوئے کائنات اپنی ہتھیلیاں مسلتے

ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔ مسکان تو خود اس کے ہونٹوں پہ بھی تھی۔ کائنات سے سنی ہوئی کہانی پر یا نومی کی ذہانت پر؟ اس کا فیصلہ اس پل تو وہ خود بھی کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ بے طلب چائے کی پیالی پہ نگاہ پڑتے ہی وہ خوش ہوگیا۔ اک ذرا سی سرکو جنبش دی تو دیکھا چاروں بیٹیاں اپنی ماں کے ساتھ کمرے میں آگئی ہیں، اور سبھی مسکرا رہی ہیں۔ مگر بیوی کے ہونٹوں پر براجی مسکان کچھ زیادہ گہری تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے پیالی خالی کرنے کے بعد بیوی کو لوٹائی تو سب سے چھوٹی بیٹی نے ہاتھ بڑھا کر پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اک ذرا سا بدن کو ترچھا کرتے ہوئے سرہانے سے اس نے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھایا۔ ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور چاہا کہ پھر ترچھا ہوکر دیا سلائی کا بکس بھی اُٹھائے کہ ماچس کی تیلی کا شعلہ بھڑکا۔ نومی نے اس کی سگریٹ جلائی اور حنان سے بولا:

''اب تم سناؤ۔

''نانو کیسی لگی کہانی؟

حنان نے پوچھا تو اس نے جواب دیا:

''ٹھیک تھی۔

''ہوں.....

ہنکاری بھرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر حنان نے پہلو بدلا اور نانا سے مخاطب ہوئی:

''یہ کہانی ہے بھی یا نہیں؟ معلوم نہیں۔ میں نے ممی کو سنائی تھی تو انہوں نے کہا یہ کہانی نہیں ہے۔ ہم جب بابا کے گھر جائیں گے انہیں سنا کر پوچھنا۔

''لیکن تم نے تو پہلے ہی وہ بات کہہ دی جو تمہیں بابا سے بعد کو کہنی چاہیے تھی۔

اس کی ماں نے بیٹی کو ٹوکا تو حنان برجستگی سے بولی:

''تو کیا ہوا؟

''کچھ نہیں ہوا؟''

ماں کا لہجہ کرخت ہوا تو نانا نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو گھورا اور آہستہ سے کہا:

''وقت بدل گیا ہے بیٹی۔

''یہ ڈائیلاگ تو میری کہانی کا ہے نانا! سپاہی اپنی بیوی سے آخر میں یہی کہتا ہے۔

کائنات کے اعلان پر سب ہنسنے لگتے ہیں اور جب سنجیدگی اختیار کرتے ہیں تو حنان کہتی ہے:

''پتہ ہے، ایک دن کیا ہوا؟ میری کلاس فیلو عنبرین ہانپتی کانپتی میرے پاس پہنچی۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ اس سے گھبراہٹ کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا میرے گھر میں ہنگامہ ہوگیا رے۔ امی اور ابو میں دو تین دن سے خوب تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ پہلے تو میں حیران ہوئی کہ یہ کیا ہونے لگا، پھر پڑوسی پریشان ہوئے۔ امی کہہ رہی تھیں غلطی ابو کی ہے۔ ابو بول رہے تھے امی کی سراسر غلطی ہے۔ پڑوسیوں کی موجودگی میں دونوں لڑے، خوب جھگڑا ہوا۔ ابو نے غصے میں امی کو کہہ دیا: طلاق، طلاق، طلاق۔ آج پڑوسی ایک مولوی کو پکڑ لائے ہیں۔ سب گھر میں جمع ہیں، تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میرے پاپا نے عنبرین سے کہا: بیٹا حنان سے مسئلہ نہیں سلجھے گا تو عنبرین نے پاپا سے کہا: انکل! یہ تو پورے اسکول میں پرابلمز سولو کرنے میں مشہور ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ دیکھیں یہ کیسے چٹکی بجاتے کام ختم کرے گی۔ پتہ ہے؟ پاپا ہمیں ساتھ لے کر عنبرین کے گھر پہنچے تب بھی وہاں باتیں ہو رہی تھیں۔ پاپا کے معلوم کرنے پر پتہ چلا عنبرین نے جو کچھ سنایا ٹھیک ہی سنایا۔ پاپا نے مولوی سے کچھ پوچھا تو وہ کہنے لگے: اس خاتون کو حلالہ کرنا ہوگا۔ میں نے پاپا سے پوچھا کہ وہ کیسے کیا جاتا ہے تو پاپا اور سب کے سب چپ ہوگئے۔ جب سبھی کو

میں نے چپ پایا تو مولوی صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے تھوڑا رُک رُک کر مجھے بتایا کہ حلالہ کیا ہے۔ میں نے غور سے بڑی توجہ کے ساتھ اُن کی باتیں سنیں، پھر اُن سے کہا: عنبرین کی امی کسی دوسرے مرد سے بیاہ کیوں کریں جی؟ پتہ ہے نانو! مولوی صاحب کیا بولے؟ وہ بولے: اس لیے کہ تمہاری سہیلی کے ابو نے تمہاری سہیلی کی امی کو طلاق دیدی ہے۔ پتہ ہے پھر کیا ہوا؟ میں نے مولوی صاحب سے کہا: ابھی دوروز پہلے سب ایک شادی میں شریک ہوئے تھے۔ میں اپنے پاپا کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں پر بھی آپ کی طرح ایک صاحب کچھ پڑھ رہے تھے۔ میرے معلوم کرنے پر پاپا کے برابر میں بیٹھے ایک صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب نکاح پڑھ رہے ہیں۔ یہ ختم ہوگا تب ہی شادی مانی جائے گی۔ پتہ ہے مولوی صاحب نے مجھ سے کیا کہا؟ وہ بولے، انہوں نے تم سے بالکل درست کہا۔ پھر پتہ ہے کیا ہوا؟ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی نکاح پڑھے تو شادی ہوگی۔ لڑکا لڑکی میاں بیوی بنیں گے اور میاں طلاق طلاق طلاق بولے تو شادی ختم ہو جائے گی۔ یہ کیسے ہوگا مولانا؟ مولوی صاحب نے مجھ سے کہا تمہاری سہیلی کے ابو نے ناراض ہوکر غصہ میں طلاق طلاق طلاق کہہ دیا اس لیے طلاق ہوگئی۔ میں ان سے بولی علی گڑھ کا تالا نوتال کی چابی سے کیسے کھل سکتا ہے؟ آپ کہتے ہو غصے میں طلاق طلاق بولے۔ بولے کہ نہیں۔ مولوی صاحب تو چپ رہے۔ باقی لوگ کھسر پھسر کرنے لگے تو میں نے عنبرین کے ابو سے پوچھا۔ کیوں انکل آپ نے غصے میں کہا نا؟ وہ بولے، ہاں بیٹی میں نے غصے میں کہا تھا۔ پتہ ہے پھر کیا ہوا؟ میں نے ان سے بولے تو، عنبرین کے ابو سے پوچھا۔ تو پھر آج یہ سب کیوں جمع ہیں؟ اس لیے کہ آنٹی آپ کے گھر سے چلی جائیں۔ میں نے عنبرین کے ابو سے پوچھا تھا مگر جواب مولوی صاحب نے دیا، وہ بولے، ہاں بیٹی! انہیں چلا جانا چاہیے، تو میں نے کہا، کیوں جائیں؟ انکل نے

اپنی عنبرین کے سامنے غصے میں آنٹی سے تین بار طلاق کہا اب آپ سب کے سامنے پیار سے تین مرتبہ نکاح کہہ دیں۔ جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔ نانو! پتہ ہے پھر کیا ہوا؟ ایک ایک کر کے سب کھسک لئے، مولوی صاحب نے مجھے اپنے پاس بلایا، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعائیں دیتے ہوئے عنبرین کے ابو سے بولے: اس معصوم نے مسئلہ حل کر دیا۔ پھر اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے: اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے، بری نظر سے بچائے۔ میں ان سے بولی: عنبرین کے ڈیڈی کو بھی آپ ڈانٹیں کہ ہم بچوں کو تو یہ بولتے ہیں غصہ حرام ہوتا ہے اور خود غصہ میں.....

''مولوی صاحب نے انہیں ڈانٹا یا نہیں؟

نانا نے نواسی سے پوچھا۔

''کیا معلوم؟ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے، مجھے غور سے مگر پیار سے دیکھنے کے بعد ایک مرتبہ گھور کر انکل کو بھی دیکھا تھا۔ ابھی کچھ روز پہلے ٹی۔وی پر بھی ایک پکچر دکھائی گئی تھی۔ اس میں بھی یہی لفڑا تھا مگر نانو! میں آپ سے پوچھتی ہوں، مردوں کو اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟ اور اپنی عورت پر ہی کیوں آتا ہے؟ مولوی کا پڑھا نکاح ان کے بولنے سے کیسے ختم ہو جاتا ہے؟

سوال نانا سے کیا گیا تھا اور وہ بار بار حنان و کائنات کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں تو اور بھی تھیں۔ کھلی کھلی بیٹیوں کی آنکھیں، سوال ان میں بھی تھے اور جواب..... اس نے محسوس کیا جواب ہے، پر کہاں ہے؟ اس نے سوچا، اس کا جواب تو سچ مچ ہوگا۔ ہم ہی سے کھو گیا ہے۔ ایک دم سے اسے حنان کا ایک اور سوال بھی یاد آ گیا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی کو بھی وہ سوال اس وقت یاد نہ آیا۔ اس سے پہلے کہ کسی کو اس کی یاد آئے، اس نے نومی کو مخاطب کیا:

''ہاں بھئی نومی، تم بھی تو سناؤ۔

''میرے پاس تو کوئی کہانی نہیں ہے نانا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے چاند؟ جب تک دادی ہیں، نانی ہیں، ماں ہیں کہانیاں بھی رہیں گی۔

''میرے پاس تو صرف سوال ہیں نانا۔ امی ابو کہتے ہیں اللہ ایک ہے اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ اسکول میں پڑھایا جاتا ہے عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔ ابو جانتے ہیں، میں آم شوق سے کھاتا ہوں۔ کئی بار ان سے پوچھا ایک سال آم بہت زیادہ میٹھا کیوں ہوتا ہے ایک سال مٹھاس کم کیوں ہو جاتی ہے؟ میں نے کئی مرتبہ امی سے ابو سے پوچھا، ابو کے کہنے سے ایک بار مولوی صاحب سے بھی پوچھا کہ میں اپنے ماں باپ کا بیٹا ہوں۔ مجھ میں ماں کا حصہ کتنا ہے۔ بس جواب ملا بھی تو اتنا کہ ماں کا حق زیادہ ہے۔ میرے پاس سوال ہی سوال ہیں نانا۔ کیا سوالوں سے بھی کہانی بن سکتی ہے.....؟

نومی یقیناً نانا سے مخاطب تھا۔ سب ہی ہمہ تن گوش تھے اور اس کی نگاہیں میز پہ رکھے کاغذ پر مرکوز تھیں۔ خود اس نے کچھ دیر پہلے لکھا تھا۔ اس کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہہ بھی کیسے سکوں گا جس کے متعلق میں خود بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہ محسوس کرتا ہے کائنات، نومی اور حنان کے آنے سے پہلے ذہن کی ہنڈیا میں جو کھد بد ہو رہی تھی۔ اس پل نہیں ہو رہی ہے۔ بس سنسناہٹ کی کیفیت ہے۔

○○

موسم

ماں اور بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے باپ کے دماغ میں کئی روز سے بھڑکتے غیظ کے شعلے ماند پڑنے لگے۔ اسے اپنی بدلتی ہوئی کیفیت پر خود بھی حیرت ہوئی، اس نے سوچا: حیرت بھی عجیب جذبہ ہے، دل میں امنڈتا ہے تو ذہن کی ہر ہر نس میں طوفان برپا کردیا کرتا ہے اور جب برسنے پر آتا ہے تو بھڑکتے غصے کے شعلوں کو بجھادیتا ہے۔ اور اپنی دُنیا بھی عجیب دُنیا ہے، کسی پر

مہربان ہوگی تو دوسروں کی خوبیاں بھی اس کی نذر کردے گی اور جب اس سے منھ موڑے گی.....

خود اس کے اپنے دماغ میں طیش کی آگ خوش گوار ازدواجی زندگی کے بدلتے موسم کی وجہ سے بھڑکی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں خوش گواری کا تصور سو فیصد موزوں نہ تھا کیونکہ اس کا ذہن تو بہت چھوٹی سی عمر ہی سے سوچنے کے مرض میں مبتلا ہوگیا تھا اور اس کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر نے نہیں وقت نے کیا تھا۔ وہ جانتا تھا زندگی میں سب کچھ بہتر ہی بہتر نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ رہتی ہے۔ جو بڑھے تو بد سے بدتر ہوکر رشتوں کو توڑے بغیر نہیں رہتی، لیکن اگر ذہن خود ہی سوال قائم کرنے کے بعد اوروں سے اس کے جواب کی فوراً اور من چاہی خواہش نہ کرے تو رشتے ٹوٹتے نہیں، نبھائے جاتے ہیں۔ اس کی اپنی ازدواجی زندگی دریا تو نہیں تھی، دریا سے نکلی نہر بھی نہ تھی، نہ ہی نہر سے نکلے رجبہا سمان تھی۔ اس نے تو جب بھی اس مسئلے پر سوچا تو اسے یاد آئے قابل کاشت زمین کے وہ چک جن کی خاطر پانی ضروری ہوتا ہے اور ان تک پانی رج بہے سے یونہی نہیں پہنچتا۔ کسان آپسی سمجھوتوں کے بعد اپنی اپنی زمینوں میں ڈول بناتے ہیں۔ ادھر ادھر ڈول بنے تو نالی کے وجود کو ترکرتا پانی وار، وار چکوں کو سیراب کرتا ہے۔ کسانوں کے باہمی سمجھوتے جب متاثر ہوتے ہیں یگانگت کے موسم بدل جاتے ہیں۔

اڑتیس برسوں کی ازدواجی زندگی میں موسم کی تبدیلی کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ پریشان سا ہوگیا اور جب اطمینان بخش جواب اسے نہ سوجھا تو پہلے اس کے ذہن میں اتھل پتھل ہوئی اور جب وہ بڑھی تو اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ پیدا ہوگئی، اس کے اثرات گھر کے ہر فرد پر پڑنے لگے۔ پہلے ان کے ذہنوں میں سوالوں کے دیے جلے، ردعمل کی ہوا چلی تو وہ بجھ گئے، رشتے کی نزاکت کے

کارن بچے صرف منھ بنا کے رہ گئے، پر وہ جو زندگی کی شریک تھی اس نے اپنا ردِعمل چہرے کے تاثرات کے ساتھ زبان سے بھی ظاہر کرنا شروع کردیا۔ اس نے سوچا یہ تبدیلی کیسے آگئی، پہلے تو وہ خاموش رہا کرتی تھی، اس کی چپ نے تو گھر کی چاردیواری میں سوتیلی ساس، نندوں، جٹھانی، دیورانی کو بھی ہرایا ہے۔ خود اس کے اپنے گھر میں تو سب ہی اس کے اپنے ہیں۔ دو بیٹیاں، جن کے کفو کا اسی کی طرح وہ بھی انتظار کررہی ہے۔ بڑی بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی۔ دو بیٹے ہیں، بیٹے بھی ایسے ویسے نہیں، سعادت مند بیٹے جو باپ اور ماں کے اشاروں کو جانتے پہچانتے ہی نہیں اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں۔ اور تمام بچے بھی ماں کے بدلے ہوئے رویے پر حیران ہیں۔ ایک بیٹے نے تو خود اس کے سامنے ہی ماں سے دبے لفظوں میں شکوہ بھی کیا مگر ماں کی ایک ہی گھڑکی پر بیٹے نے چپ سادھ لی اور باپ نے محسوس کیا، خود بیٹے کے ذہن میں سوال روشن ہونے لگے ہیں۔ ایک آدھ بار بیٹے نے اس مسئلے پر باپ سے بات کرنا چاہی پر کامیاب نہ ہوا اور بس منھ بنا کر رہ گیا۔ شاید اس کے دماغ کے کسی گوشے میں سکڑے، سمٹے خوف نے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کردیے ہوں۔ اس کے چہرے پر ابھرتے تاثر کو باپ دیکھ رہا تھا اور انہیں سمجھنے کے باوجود بھی جانے کیوں اپنے حق میں بہتر نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کے اپنے ذہن میں تو بس ایک سوال روشن تھا: یہ تبدیلی کیوں آئی ہے؟ میں اپنے فرائض سے غافل تو نہیں ہوا ہوں، ابھی تو ملازمت سے سبکدوش ہونے میں بھی کافی وقت ہے۔ ذہن کو ایک جواب سوجھا۔

وقت..... اس نے سوچا، وہ تو کبھی کسی پر ایک سا نہیں رہتا، ایسا ہونے لگے تو آدمی اکتانے لگے، اس کی تبدیلی تو ہمارے سامنے امنگوں، حوصلوں، عزائم اور عمل کی اتنی صورتوں میں سامنے آتی ہے کہ منصوبے شرمانے لگتے ہیں۔ بیوی کیا منصوبے بنارہی ہے؟ اڑتیس برسوں کے گرہست جیون میں اس کا وجود امنگ،

عزم، حوصلے اور عمل کے جواہر سے آراستہ ہی نہیں ہوا۔ خود اس کی اپنی ذات ہی شوہر کے منصوبوں کی تکمیل میں حوصلہ بنتی رہی ہے۔ اسے یاد آیا، نامساعد حالات میں بیوی نے ایک نہیں کئی بار اس سے کہا:

''چھوٹی سی زندگی میں دیکھا، دُنیا میں دو آدمی کبھی سیر نہیں ہوتے۔

''دو آدمی؟ تم جانتی ہو انہیں؟

''ہاں جانتی ہوں۔

''کبھی ملی ہو ان سے؟

اسے یاد آیا، سوال کرنے سے پہلے اور سوال کرتے ہوئے اس کے دماغ کی کسی نس میں کچھ سرسرایا تھا، اور بیوی کا جواب سن کر سرسراہٹ معدوم ہوگئی تھی۔

''میں کیا جی، ان سے تو سب ہی ملتے ہیں۔

''سب.....تم.....تم کہنا کیا چاہتی ہو۔

''اجی! حیران کیوں ہو رہے ہیں آپ؟

''کمال ہے یار! جس کا مجھے پتہ نہیں، تم اس پر اتنے یقین سے کہہ رہی ہو اور مزے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک تمہاری زبان سے کچھ نکلا بھی نہیں۔

''اچھا تو ایک بات بتائیں، ابھی ابھی آپ نے کہا جس کا مجھے پتہ نہیں۔ کہانا؟ یہ..... یہ پتہ کیا ہوتا ہے جی؟

''پتہ!

''ہاں پتہ پر ایڈرس نہیں۔ پتہ۔

''علم۔

اسے یاد ہے اس کے لہجے کے تحیّر پر بیوی نے مسکراتے ہوئے پلکیں میچ کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور اس پل اسے اس کا انداز بڑا ہی پیارا لگا تھا۔

''مجھے ان کے بارے میں بتا ہی دو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی

سے کہا تھا تو اس نے پلٹ کر پھر پوچھا۔

''ضرور، پر پہلے آپ یہ بتائیں کہ ہمیں جس چیز کا پتہ ہے، وہ مکمل ہوتا ہے؟

اسے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ پھر حیرت میں پڑ گیا تھا، اور سوچنے لگا۔ وہ آج کیسی باتیں کررہی ہے؟ اسے اچھی طرح یاد ہے اس روز اس نے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے سائے اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کی حیرت دور کردی تھی:

''اجی حضرت! جس کی بات میں کررہی ہوں ان سے آپ بھی ملتے ہی رہتے ہیں اور آپ ہی کیا، ہر آدمی کہیں نہ کہیں ان سے مل ہی لیتا ہے۔ اور ..... وہ .....وہ اور کوئی نہیں ہمارے ہی جیسے ہوتے ہیں۔

''مگر وہ ہیں کون؟

''ایک تو وہ جو دولت چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو سب کچھ جان لینا چاہتا ہے۔

آج وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوی آخر کیا جان چکی ہے؟ یا، کیا جان لینا چاہتی ہے؟ آخر ہماری اڑتیس برسوں کی زندگی پر گھٹا سی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ ہوا بھی تو نہیں چل رہی۔ حبس کا عالم ہے اور دل ودماغ کے دریچے تازہ ہوا کے ایک جھونکے کا انتظار کررہے ہیں۔ دریچے کے دونوں ہی پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ اور..... گھٹن ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اسی گھٹن کی وجہ سے وہ چڑچڑا ہونے لگا تھا، اس کا اثر بھی پورے گھر پر پڑ رہا تھا۔

بچوں کی خاموشی اور اُن کے تاثرات کو وہ خود کوئی نام نہیں دے پارہا تھا۔ یہ کیفیت اس دن تک پورے گھر کو اپنی گرفت میں جکڑے رہی جس روز ان کی بڑی بیٹی اپنی سسرال سے میکے آئی، ماں سے ملنے کا اس کا والہانہ پن خود اسے بھی اچھا لگا، اس کے بعد جب اس نے باپ کو اپنے سے لپٹایا تو پل بھر کو اُس نے محسوس کیا، تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا ہے۔ کچھ دیر رسمی گفتگو

رہی، ماں اپنی سمدھن اور بچی کی نندوں کے احوال دریافت کرتی رہی، داماد کو پوچھا، خود اس کے اپنے بچے کے بارے میں معلوم کیا، پھر تینوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر بیڈروم میں جا بیٹھی۔

شام کب ہوئی، رات کب دبے پاؤں چلی آئی؟ اسے پتہ ہی نہ چلا، بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن پر اکتاہٹ سوار ہوئی تو اسے اپنا ایک دوست یاد آیا، اس نے سوچا میرے یار نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ وہ خیریت سے تو ہے نا؟ ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر خود اسی سے کیوں نہ پوچھوں، وہ اپنی جگہ سے اٹھا، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے وہ جوں ہی بیڈروم کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے آنے والی آواز نے اس کے قدم روکے۔ ماں اور بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے باپ کے دماغ میں کئی روز سے بھڑکتے غیظ کے شعلے ماند پڑنے لگے۔ اسے اپنی بدلتی ہوئی کیفیت پر خود بھی حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا: حیرت بھی عجیب جذبہ ہے، دل میں امنڈتا ہے تو ذہن کی ہر ہر نس میں طوفان برپا کردیا کرتا ہے اور جب برسنے پر آتا ہے تو بھڑکتے غصے کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے۔ اور اپنی دُنیا بھی عجیب دُنیا ہے، کسی پر مہربان ہوگی تو دوسروں کی خوبیاں بھی اس کی نذر کردے گی اور جب اس سے منھ موڑے گی تو اس سے اس کی ذاتی خوبیاں بھی چھین لے گی۔

''تم پوچھتی ہو میری نگاہ میں تمہارے ڈیڈی کا پہلا والا مرتبہ کیوں نہیں رہا؟

''کیا غلط پوچھ رہی ہوں؟

بڑی بیٹی کا استفہامیہ انداز بتا رہا تھا کہ بہنوں نے اسے صورت حال سے آگاہ کردیا ہے۔ بیٹی کے سوال پر کچھ دیر تک ماں چپ رہی پھر اس سے کہا:

''نہیں، تمہارا سوال ٹھیک ہے۔ پر چندا، ایک بات غور سے سن اور سمجھ، میری نظر میں ان کی جگہ وہی ہے پر..... پر، اب اس کی وہ اہمیت نہیں رہی۔

''کیوں؟

بیٹی کے لہجے کی کرختگی اس کی حیرت کا اعلان تھی۔

''کیونکہ میرے بیٹے جوان ہوگئے ہیں اب..... اب وہ میرے مضبوط سہارے ہیں۔

باپ نے اک ذرا سے کھلے ہوئے کواڑوں کی درز سے آنکھ لگائی، دیکھا، بڑی بچی گُر کی بات سن لینے کے بعد ماں کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اور وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتی جارہی ہے۔ وہ سوچنے لگا، جن کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے ان کی جگہ زمین کے پانچ چھ فٹ اندر ہوتی ہے، زمین کے اوپر نہیں۔ دل سے گرنے والا تو اٹھ بیٹھتا ہے۔ پر نظر سے گرنے والا تو گرا پڑا ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ خود فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس انکشاف کے بعد وہ بیوی کے دل سے گرا، یا، نظروں سے؟ اس نے محسوس کیا وہ زمین میں دھنستا ہی جارہا ہے۔ بس اک ذرا سا ڈگمگایا تھا کہ بیٹی کی آواز نے سہارا دیا۔ وہ ماں سے اسی لہجہ میں کہہ رہی تھی:

'' جن سہاروں کی تم بات کررہی ہو وہ کب تک اپنے کو تمہاری خاطر مضبوط رکھ پائیں گے؟ میرا مطلب ہے، کل کلاں ان سہاروں کی ضرورت اس گھر میں آنے والی دو بہوؤں کو بھی تو ہوگی ۔ ایک دن وہ بھی تو ماں بنیں گی پھر کیا ہوگا؟

○○

رہپٹ

''اس پتے پر آپ کے مہمانوں کو صرف ایک بوڑھی عورت ملے گی، اس سے مل کر یہ کیا کریں گے؟

یہ سوال تنویر سے کیا گیا اور اس نے جواب طلب نظروں سے اپنے بھائی منور اور اس کے دوست کو دیکھا، دونوں دوستوں نے تنویر کی آنکھوں کے مفہوم کو سمجھنا چاہا کہ اسے ہی نہیں اس کی اسٹینو کو جواب دے سکیں، پل بھر میں دونوں ہی

دوستوں نے ایک ہی ساتھ جواب دینا چاہا پر دونوں کی زبان لرز کر رہ گئی، ہونٹ ہلے ضرور پر کوئی آواز نہ نکلی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا پھر ایک ہی ساتھ ان کی نظریں اسٹینو کے چہرے پر مرکوز ہوئیں، اسٹینو کی آنکھیں اب بھی ترتھیں اور اس کا اپنا اضطراب ان میں تھرک رہا تھا۔

غازی اور منور کچھ ہی دیر پہلے ہوٹل، میں داخل ہوئے تھے، منور کا بھائی تنویر اس ہوٹل میں مینیجر کے عہدے پر مامور تھا، وہ اسی سے ملنے اور یہ بتانے آئے تھے کہ انہیں ویزا مل چکا ہے اور ان کے ٹکٹ بھی کنفرم ہو گئے۔ تنویر اپنے کمرے میں موجود نہ تھا۔ اس کے متعلق دریافت کرنے کی غرض سے دونوں استقبالیہ کاؤنٹر پہنچے اور غازی نے فریم کے شیشے میں قاتل کو منصوبے کا آخری پنچ دیتے دیکھا لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ کسی پر قاتلانہ حملہ ہوتا وہ حملہ آور پر جھپٹ پڑا، اس کی بائیں مٹھی کی گرفت میں حملہ آور کی دائیں کلائی تھی اور کسی کو ختم کر دینے والا ریوالور خود قاتل کی اُنگلیوں میں لرز رہا تھا۔ دوسرے ہی منٹ منور، اس کے بھائی اور کچھ لوگوں نے حملہ آور کو جکڑ لیا، ریوالور رومال میں محفوظ کیا گیا، دومنٹ بعد پولس آگئی اور صرف پانچ منٹ بعد ہوٹل کے ریکریشن ہال کی مصروفیات معمول پر آگئیں، منور، غازی اور تنویر کی اسٹینو گرافر کے علاوہ کوئی بھی محسوس ہی نہیں کر رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے ہال میں ایک قتل ہونے والا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھے لوگوں میں سے بعض کی آنکھوں میں چند منٹوں پہلے کا واقعہ کوند رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کس پھرتی سے ایک دلیر جوان نے حملہ آور کے منصوبے کو ناکام ہی نہیں کیا بلکہ اسے پولس کسٹڈی میں بھی پہنچا دیا۔ آدمی ہے یا بجلی کا کوندا؟ تنویر کی اسٹینو نے اس پل سوچا تھا اور دومنٹ بعد ہی وہ سب تنویر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ تنویر نے ان سے روانگی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ منور کے جواب دینے پر پل بھر کو کمرے میں خاموشی چھائی مگر دوسرے ہی لمحے اسے لائٹر کی آواز نے توڑا،

تنویر نے سگریٹ کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تھا:

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم دونوں بمبئی کیوں جانا چاہتے ہو؟

''ہمیں کسی سے ملنا ہے۔ منور نے بھائی کو جواب دیا۔

''بمبئی جائیں گے آپ دونوں؟

اسٹینو نے ان سے پوچھا تھا اور جواباً دونوں کے ہلتے ہوئے سر دیکھ کر اس نے سوال کیا کہ انہیں کہاں جانا ہے؟ اس سے پہلے کہ دونوں میں سے کوئی جواب دیتا، تنویر نے اُنہیں بتایا کہ میری اسٹینو بمبئی کی ہیں، فوراً ہی غازی نے اپنی جیب سے ڈائری نکالنے کے بعد اس میں سے ایک کارڈ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ کارڈ پر نگاہ پڑتے ہی لڑکی کی آنکھیں پہلے تو پھیل گئیں پھر اس کے دیدے رِسے اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکے نین کٹورے چھلک گئے۔ تینوں نے استعجابیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ غازی اور منور نے کچھ بولنے کا ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ تنویر نے اسٹینو کی طرف رومال بڑھاتے ہوئے کہا:

''تم رو رہی ہو۔

جواب میں اسٹینو نے اثبات میں سر ہلایا اور کارڈ میز پر رکھ دیا تھا۔ تنویر نے اسے اٹھا کر نام پڑھا اور جب پتے پر اس کی نگاہ پڑی تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اک ذرا سی جنبش ہوئی۔ اسے یاد آیا ہوٹل کے رجسٹر میں یہ پتہ بھی درج ہے۔ تنویر کی آنکھیں تصدیق کی خاطر اسٹینو کے چہرے پر پڑیں، اس سے پہلے کہ وہ لفظوں سے آراستہ ہوں اسٹینو اپنے مینیجر سے بولی تھی:

''اس پتے پر آپ کے مہمانوں کو صرف ایک بوڑھی عورت ملے گی، اس سے مل کر یہ کیا کریں گے؟

غازی اور منور نے لڑکی کے دیدۂ تر میں لرزیدہ پریشانی کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچا۔ ایک دوسرے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کی اور منور لڑکی

سے مخاطب ہوا:

''آپ انہیں جانتی ہیں؟

اسٹینو نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی، سر کو ہلاتے ہوئے پل بھر کے لیے اس کی نظریں منور کی نظروں سے ٹکرائیں اور اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ منور کی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ یہ تو..... یہ تو جانی پہچانی آنکھیں ہیں۔ کہاں دیکھا ہے انہیں؟ سوال اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ادھر کرسی پر بیٹھا منور اس اجنبی لڑکی کے پورے وجود کو اپنائیت کے بھرپور جذبے سے دیکھ رہا تھا۔

''سر! مجھے کم سے کم ایک ہفتہ کی چھٹی دے دیں کیونکہ آپ کے مہمانوں کے ساتھ میں بھی بمبئی جانا چاہتی ہوں۔ تنویر نے غور سے اسے دیکھا، گھنٹی بجائی، ویٹر کے آنے پر سب کے لیے چائے لانے کو کہا اور میز کی دراز میں سے ایک فائل نکال کر اس کے ورق پلٹنے لگا۔ اسٹینو کی آنکھوں میں امید کے چراغ لرزنے لگے اور غازی و منور کے دلوں میں یقین اور غیر یقینی احساس میں جنگ ہونے لگی۔ تنویر نے کنکھیوں سے تینوں کو دیکھا اور ایک ورق پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ دو منٹ بعد جب ویٹر چائے کی پیالیاں ان سب کے سامنے رکھ چکا تو تنویر نے میز پر سے قلم اُٹھا کر اسٹینو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''ضابطے کی کارروائی کے لیے اپیلی کیشن لکھ دو اور پرسوں ان کے ساتھ ہی چلی جاؤ مس اوشا۔

——○——

تین روز بعد تینوں ساتھ ہی اس دروازے پر کھڑے ہوئے تھے، کواڑ بوڑھی عورت نے کھولے، اوشا پہ نگاہ پڑتے ہی پہلے تو اس کی آنکھیں

پھیلیں، پھر وہ مسکراتے ہوئے بیٹی کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ غازی اور منور خوش گوار حیرت سے دوچار ہوئے۔ دونوں نے پہلے تو ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا پھر سوچنے لگے: تین روز پہلے اس لڑکی نے کیوں نہ بتایا کہ ہم جہاں جانا چاہتے ہیں وہ اس کا اپنا گھر ہے اور وہاں صرف میری ماں رہتی ہیں؟

''میری ماں ہیں.... اوشا نے ماں کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تو وہ مسکراتے ہوئے اس کی ماں کو دیکھنے لگے۔ بیٹی نے ان دونوں کا ماں سے تعارف کرایا تو دونوں نے ایک ساتھ ہی اوشا کی والدہ کو سلام کیا۔ جواب میں بوڑھی کا ہاتھ بڑھا اور غازی کے سر پہ جا پہنچا۔ انہوں نے اسے دُعائیں دیں اور جب وہ منور کے سر پر ہاتھ رکھ رہی تھیں تو ان کے دل نے کچھ زیادہ ہی دھڑکنا شروع کر دیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی زبان سے نکلا:

''یگ یگ جیو، چلو اندر چلو، چائے وائے پیو۔

دس پندرہ منٹوں کا وقفہ غازی، منور اور اوشا کے ذہنوں میں مختلف کیفیتوں کو جنم دیتے ہوئے گزرا، اوشا کچن میں ماں کا ہاتھ بٹاتے ہوئے بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ منور چھوٹے سے فلیٹ کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا اور غازی چھوٹے سے ہال میں ٹہلتے ہوئے دروازے سے ملحق دیوار پر آویزاں جو اُن کی تصویر کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ تصویر کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پچیس برس کے جوان کی تصویر پر زرد پھولوں کی مالا پڑی ہوئی تھی، اس کے برابر ہی ایک اور تصویر بھی تھی۔

''یہ ہمارا فیملی سنیپ ہے۔

اوشا نے اسے مخاطب کیا اور اپنی انگلی تصویر پر رکھ کر بتانے لگی۔

''یہ پتا جی ہیں، یہ بڑے بھائی ہیں، اور.....اور.... یہ ..... یہ ان سے چھوٹے پر..... پر.....

اوشا کی آواز تھرائی تو غازی نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں، اس نے اوشا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا:

''میں .....میں جانتا ہوں، یہ..... یہ ویر ہے۔

''آپ کیسے جانتے ہیں؟ یہ تو..... یہ تو.....

اوشا کوشش کے باوجود اپنا سوال پورا نہ کرسکی۔ سوال تو وہ کر ہی چکی تھی پر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی، ایسی کوئی بات جو سوال سے جڑی ہو۔ غازی نے غور سے اسے دیکھا پھر اس کے سر پر سے ہاتھ ہٹایا اور اُوشا کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا:

''یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ ویر اب نہیں رہا۔

''ہاں بیٹا، فوج میں تھا وہ۔

اوشا کی ماں نے غازی کو مخاطب کیا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا چھوٹی سی تپائی پر چائے، بسکٹ اور دال موٹھ کی طشتریاں لگی ہوئی تھیں، منور کے برابر والی کرسی پہ بیٹھی ویر کی ماں غازی کو دیکھ رہی تھی۔ غازی نے کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا، مجھ سے تو اوشا باتیں کر رہی تھی، ویر کے بارے میں سچ کا اظہار وہ نہ کر پائی۔ اس ضعیف نے کتنے رسان سے اپنے جوان کی موت کا اعتراف کر لیا ہے..... اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد بوڑھی کو دیکھتے ہوئے سوچا..... ویر یوں ہی تو ویر نہیں ہوتے۔ اس نے سنا ویر کی ماں کہہ رہی تھی:

''اُوشا کے باپ اور میں نے بڑے جتن سے اپنے بچوں کو پالا تھا۔ بڑا لڑکا بڑا ہونے کے بعد اتنا بڑا ہوا کہ ماں باپ بھی چھوٹے ہو گئے۔ میرے پتی ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی پنشن میں ویرو کو جہاں تک پڑھانا چاہتے تھے نہ پڑھا سکے۔ جیسے تیسے ویرو نے میٹرک کیا۔ نوکری ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ زیادہ ہی پریشان ہوگیا تو پھر وہ فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ ہماری بوڑھی سانسوں میں تھوڑی سی طاقت آنے لگی تھی۔ میری اوشا نے بچپن کھیلتے کودتے نہیں پڑھتے

پڑھاتے گزارا ہے۔ اس کے باپ کہا کرتے تھے: ہم نے اس کا نام غلط رکھ دیا ہے، اس کا نام آشا رکھنا چاہیے تھا ہمیں۔ میں ان سے کہتی تھی: آشا تو ویرو کے شریر میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ آپ نراش کیوں ہوتے ہیں؟ اچھے دن بھی آئیں گے، پر ..... ہمارے سپنے بکھر گئے۔ ویر پاکستانی سپاہیوں سے لڑتے ہوئے مر گیا۔ اس کی لاش بھی ہمیں کئی ہفتوں بعد ملی، پر.....

کمرے میں ویر کی ماں کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ منور نے انہیں اپنے سے لپٹایا اور بائیں ہتھیلی سے ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے۔

''بھائی کی شہادت کے تین مہینے بعد سے ہر مہینے تین ہزار روپے ماں کے نام آتے رہے۔ جس دن پتا جی کا دیہانت ہوا، اس روز بھی وہ آدمی روپے لایا تھا جو ہمیشہ لایا کرتا تھا۔ میں نے کسی طرح بی۔اے کیا اور سروس جوائن کر لی، اسی جاب کے ذریعے میں دبئی پہنچی۔ وہ تین ہزار آج بھی آرہے ہیں۔ بہت پوچھا ہم نے اس آدمی سے، روپے کون بھیج رہا ہے، کہاں سے آتے ہیں؟ مگر روپے لانے والا کہتا تھا کہ مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ آپ کے کہنے پر میں نے سیٹھ جی سے بھی پوچھا تو انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔

''عجیب ہے یہ دُنیا بھی!

اوشا کی ماں نے بات آگے بڑھائی:

''شروع شروع میں سینا کے لوگ آئے تھے پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا، پنشن آتی ہے بس اور..... اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ہاں جب ویر کی لاش آئی تھی تب لوگ باگ آئے تھے۔ فوجی، نیتا، ٹی۔وی والے، خوب فوٹو اترے، پر اب تو اپنے محلے والے بھی نہیں آتے۔ میرے ویر کے یار دوست کوئی بھی تو نہیں آتا۔

''ہم تو آئے ہیں ماں جی.....

غازی نے کرسی کو اک ذرا سا ترچھا کرنے کے بعد ویر کی ماں کے گھٹنوں

پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

''تم.....تم، مگر تم ہوکون بیٹے؟ اور میرے ویر کو کیسے جانتے ہو؟

کمرے میں پل بھر کو خاموشی چھا گئی۔ اوشا، اس کی ماں، منور اور غازی کی آنکھیں بول رہی تھیں، دل بول رہے تھے اور ذہن اتھل پتھل ہو رہے تھے۔ غازی نے استفہامیہ انداز میں منور کو دیکھا تو اسے منور کی آنکھوں میں ذہنی اُلٹ پلٹ کی اذیت دکھائی دی، اس نے دیکھا منور نے اپنا سانس نتھنوں کے بجائے منھ سے خارج کیا ہے۔ اپنی آنکھیں بند کرنے کے بعد غازی نے ایک لمبا سانس لیا، آنکھیں کھولیں اور اوشا کی ماں سے مخاطب ہوا:

''ماں جی! میں غازی ہوں، اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا۔ یہ منور ہے۔ اوشا دبئی میں ان کے بھائی کے ہوٹل میں ملازم ہے۔ منور کے بھائی وہاں مینیجر ہیں۔ آپ کا ویر اور کئی سپاہی بھارت کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ منور، میں اور کئی فوجی پاکستان کی طرف سے۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ویر کی بندوق سے نکلی گولی میرے مثانے میں لگی تھی اور میری بندوق سے نکلی گولی نے ویر کا سینہ چھیدا تھا۔ کسی بھارتی سپاہی کی گولی منور کی آنکھیں چاٹ گئی تھی۔ زمین کا وہ ٹکڑا بھارت کا تھا یا پاکستان کا؟ ہم نہیں جانتے تھے۔ ہم تو زمین پہ پڑے موت کا انتظار کر رہے تھے۔ پاکستانی اور بھارتی لڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ ڈوبتی ہوئی نبضوں اور دھندلائی آنکھوں سے ویر مجھے اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑائی تھمی اور زمین پر سے لاشیں اُٹھائی جانے لگیں۔ مجھے، منور اور ویر کو ایک ہی ٹرک میں لاش سمجھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہلے تو خوں خوار نظروں سے دیکھا پھر جانے کیوں ویر مجھ سے پوچھ بیٹھا:

''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟

''میری..... ماں ہے بس۔

''اُف!

''یقین کیجیے ماں جی! وہ اف کہنا آپ کے ویر کا، تکلیف کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں میچ کر پہلے تو اپنے آپ کو گالی دی تھی۔ پھر انہیں جو اسلام آباد اور نئی دہلی میں بیٹھ کر غازی اور ویر کو مرواتے رہے۔ مجھے یاد ہے اس نے کہا تھا:

''میں نے تجھے نہیں اپنے آپ کو گولی ماری ہے۔'' ٹرک چل رہا تھا ماں جی اور ویر کی زبان چل رہی تھی۔ جو کچھ آپ نے اور اوشا نے سنایا وہ ویر نے بھی سنایا تھا اور پھر اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تھا....

''ارے یار!..... میرے گھر میں ماں کو سنبھالنے کے لیے میری بہن تو ہے۔ تیرے ہاں تو صرف ماں ہے۔ اسے کون سنبھالے گا؟'' ریڈ کراس کے مردہ گھر میں ہم پڑے تھے۔ ہمارے کراہنے کی آوازوں نے نگراں کو متوجہ کیا۔ وہ دوڑ کر ڈاکٹرز کو لے آیا۔ ڈاکٹروں نے ہمیں دیکھا اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے: ''انڈین سولجر کے دل کی رگیں مجروح ہوئی ہیں، دوسری گولی نے اس کے سینے میں سوراخ کر دیا ہے اور دونوں پاکستانیوں میں ایک کا مثانہ چھدا ہوا ہے اور کڈنی، دوسرے کی آنکھیں زخمی ہیں۔ ہمارے پاس کڈنی ہے نہ مثانہ، آنکھوں کے بارے میں ہمیں معلوم کرنا ہوگا۔'' مجھے یاد ہے ماں جی! ویرو نے لرزتے ہاتھ کی انگلیوں سے چٹکی بجا کر ڈاکٹر کو متوجہ کیا تھا اور جب ڈاکٹر اس کے پاس پہنچے تو اس نے کہا تھا: ''کاغذ پر میری وصیت لکھو ڈاکٹر۔ میری کڈنی، مثانہ اس کو ٹرانسپلانٹ کر دیں۔ یہ اپنی ماں کا اکلوتا ہے ڈاکٹر، اور میری آنکھیں اُسے دے دو جس کی آنکھیں نہ رہیں.....'' مجھے یاد ہے اچھی طرح یاد ہے۔ ڈاکٹر اس کی بات سن کر حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے، پھر ایک بولا تھا..... ایسا خلوص، ایسا دل رکھنے والا دُشمن تو نہیں ہوسکتا۔ مجھے فخر ہے ماں میرے جسم میں اس ویر کا مثانہ ہے جس نے ڈاکٹر سے جواب میں کہا تھا.....

دُشمن پاکستانی ہیں نہ بھارتی، ہماری دُشمن تو سرحد ہے ڈاکٹر سرحد..... اور اس پل میں نے کہا تھا..... میرے بھائی! بات پوری کر مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا ماں، جواب میں اسکی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ آنکھیں آج بھی ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ ویر کی آنکھیں منور کے کام آگئیں اور اس کی بات آج میں پوری کر رہا ہوں۔ ویر نے کہا تھا دُشمن پاکستانی ہیں نہ بھارتی، ہماری دُشمن تو سرحد ہے..... اور میں کہتا ہوں ہماری دُشمن عقل بھی ہے۔

غازی نے بات مکمل کی تو اوشا نے اور ویر کی ماں نے منور کی طرف دیکھا۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سانسیں بول رہی تھیں، کمرے سے باہر گلی میں کتے بھونک رہے تھے۔

○○

اُفوّہ

بیٹے کا جواب نہیں بادل گرجا تھا، ہمارے ذہنوں میں وسوسوں کی بجلیاں کوند گئیں۔ اب تک زندگی میں انہیں چمکتے کئی بار دیکھ چکے ہیں مگر سوالیہ نشان بن کر آج پہلی مرتبہ وہ ہمارے سامنے آئی ہیں۔ بجلی گری ہے، بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوا، اس کا امکان ضرور ہے اور ہماری کوشش ہوگی ہم میں سے کوئی متاثر نہ ہو۔

ہم ہیں بھی کئے نفر؟ میں ہوں، یہ ہیں، ہمارا بیٹا ہے اور بہو۔ میں سیشن

کورٹ میں جج ہوں۔ میری بیوی فیملی کورٹ کی منصف ہیں۔ ان کی عدالت میں اس طرح کے مقدمے ہی آتے ہیں، کوئی بہت ہی پیچیدہ قضیہ میری عدالت تک بھی پہنچ جاتا ہے، مگر یہاں تو کوئی عدالت نہیں ہے۔ ماں، باپ، بیٹا اور بہو۔ جو کچھ بھی میرے سامنے آیا وہ میری بیوی یعنی فیملی کورٹ کی جج نے بیان کیا ہے۔ ساری باتیں سن کر میں خود تو کچھ نہیں بولا، نہ یہ زیادہ بولیں، ہماری آنکھیں اور انگلیاں بولنے لگیں۔ عدلیہ اور مقننہ کی کتابوں سے دیدوں نے باتیں شروع کردی ہیں اور گھر میں چپ پاؤں پسار کر بیٹھ گئی ہے۔

ہم دونوں یوں بھی باتیں کم ہی کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان تب زیادہ باتیں ہوئیں جب شاہ بانو مقدمہ عدالتوں میں کم اور کورٹ روم سے باہر زیادہ بولنے لگا تھا۔ بیڈروم میں بھی اُس کیس یا اُس سے ملتے جلتے مقدمات کی خبریں ہماری گفتگو کا سبب ہوتی تھیں لیکن اِس مقدمے نے ہمیں بتیانے پر مجبور کردیا ہے۔ آج انہیں پک اپ کرنے فیملی کورٹ پہنچا تو میرے برابر بیٹھتے ہی اُنہوں نے پوچھا:

''کیا ہوا؟

''اس کا کوئی سرا کہیں نہ مل سکا۔

''پھر کیا ہوگا؟

''تم ملازمہ کو کریدو، گھر کے راز ان سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔

''ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر یہ راز گھر کا نہیں بیڈروم کا ہے۔

''جانتا ہوں مگر یاد رہے گھر ہمارا اور بیڈروم ہمارے بیٹے کا ہے اور ملزمہ اس کی وائف ہے۔

''جانتی ہوں اور آپ بھی واقف ہوں گے، پہلی تاریخ پر پیش ہونے والے ملزم بعد میں بے گناہ بھی ثابت ہوجاتے ہیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔

''ہم بڑے نازک اور خطرناک موڑ پر آ گئے۔ مدّعی ہمارا پوت ہے۔

'' آج میں نے بھی اس زاویے سے غور کیا تھا۔ پل بھر کو یہ خیال ذہن میں آیا، سمیر سے کہوں اس پرابلم کو فیملی کورٹ میں لے جائے ، پر اس خیال کے آتے ہی چھٹی حِس نے بیل بجا دی۔

''پھر کیا کیا جائے؟

''کرن کا ماضی.....

''کلین ہے بالکل کلین..... اس کی گواہ خود میں ہوں... اور یہ نہ بھولیے، کرن کا انتخاب میں نے کیا ہے۔

''اس مسئلے پر اس سے بات کی؟

'' آپ سے یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ شیشے میں بال آجائے گا۔

''تم سے بھی کیا یہ کہنا لازم ہے کہ بال آچکا ہے۔

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں مسٹر کنٹراکٹر! ہم بڑے نازک اور خطرناک موڑ پر آ گئے ہیں۔

بڑا پُر خطر اور نازک موڑ تھا ہماری زندگی کا وہ لمحہ جب مسز کنٹراکٹر نے مجھے مسٹر کنٹراکٹر کہہ کر مخاطب کیا۔ کاسموپولیٹین سٹی میں پرورش پا کر جوان ہونے والے ہم دونوں، پرانوں میں رہ کر بھی پرانے نہ ہونے کے باوجود، اتنے بھی نئے نہ تھے کہ ایک دوسرے کو ناموں سے مخاطب کریں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے مجھے نام لے کر پکارا۔ جانے کیوں ناگواریت کا احساس پیدا ہونے کے بعد بھی میں نے ان کے اس طرح مخاطب کرنے کا بُرا نہ مانا ، کچھ دیر کنکھیوں سے مجھے دیکھنے کے بعد انہوں نے کچھ اس طرح پہلو بدلا کہ ان کا چہرہ بائیں طرف ہو گیا۔ گھر پہنچ کر فریش ہونے کے بعد جب ہم صوفے پر بیٹھے اور روز کی طرح چائے

لے کر کرن ہمارے پاس آئی تو محسوس ہوا گھر کی خموشی کچھ اور گہری ہو چلی ہے۔ چائے پینے کے ارادے سے صوفے پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے میں نے کرن کے سراپے کا کنکھیوں سے جائزہ لیا، اور جب میری نگاہ کرن کے چہرے پہ پڑی تو دیکھا وہ خود مجھے اور انہیں اسی طرح دیکھ رہی ہے۔ انہوں نے برابر کے صوفے کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کرن سے بیٹھنے کو کہا تو وہ چپکے سے بیٹھ گئی۔ چائے کی پہلی چسکی لینے کے بعد انہوں نے کرن کو مخاطب کیا:

''کل شام پانچ بجے ڈاکٹر ایرانی کی ڈسپنسری پہنچنا ہے۔

میں نے دیکھا: کرن نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنی ساس کو دیکھا اور پھر پلکیں جھکا لیں۔ کرن کی غزالی آنکھوں میں، بس ایک بار اس کی پتلیاں متحرک ہوئی تھیں۔ پل بھر میں سوال اور تشویش کے سایوں کو باہم ادھر سے ادھر ہوتے دیکھنے کے بعد میری نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

تصویریں دیکھنے کے بعد میری نظریں سونوگرافی رپورٹ پر پڑ گئیں۔ واضح الفاظ میں صرف دو سطروں کی رپورٹ تھی:

'' باسٹھ دن اُنیس گھنٹے چونتیس منٹ اور پچاس سیکنڈ۔ آپ کی مطلوبہ ضرورت کا وقت گزر چکا ہے، نیک خواہشات کے ساتھ تسلیاں حاضر ہیں۔

لمبا سانس کھینچ کر اسے آہستگی سے نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے میں نے رپورٹ تپائی پر ڈال کر انہیں دیکھا۔ اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر مجھے مخاطب کیا:

'' ڈاکٹر کا کہنا ہے: نطفہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ہمیں ڈلیوری تک انتظار کرنا ہوگا۔

''سمیر گھر کب لوٹتا ہے؟

میرے دریافت کرنے پر انہوں نے کرن کو آواز دی تو بیڈروم کے دروازے پر کھڑی کرن نے جواب دیا:

''پتہ نہیں۔

''تم .....اس کی بیوی ہو۔

''ہوں تو ڈیڈ۔ مگر.....پچھلے کچھ دنوں سے وہ کب آتے ہیں، میں نہیں جانتی۔

جواب سن کر میں نے سمیر کو رنگ کیا۔ رابطہ قائم ہوا تو دوٹوک انداز میں کہا:

''آج سے ٹھیک نو بجے رات کو گھر آؤ گے۔

''اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ کھو جاؤں۔ آفس اور گھر کی روٹین کے علاوہ بھی میری مصروفیات ہیں۔

کھانے کی میز پر بیٹھنے کے بعد پلیٹ اپنی طرف سرکاتے ہوئے سمیر نے کسی کو مخاطب کیے بنا اعلان کیا۔ اس کی بات مجھے پسند نہ آئی، دل میں ہلچل مچی، اس سے پہلے کہ وہ غیظ کا کوئی روپ دھارتی میں نے ان کی آواز سنی:

''تم بڑے ہو چکے ہو، ہم جانتے ہیں۔ اتنے کہ اب تو ..... ہم اپنے کو چھوٹا سمجھنے لگے ہیں۔ رہی بات کھونے کی تو فی الحال تو سکون کھویا ہے۔ کل کلاں، کون کیا کھوئے.....آج یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

''بڑا عجیب سا لگا ممی! ڈیڈی نے آج پہلی بار اس طرح آرڈر دیا ہے۔

''اب تو.....اب تو آرڈر دینے والے تمہاری اپنی دُنیا میں آنے کو ہیں۔

''جانتا ہوں، اور ڈیڈی سے بتا چکا ہوں۔ میں اُس کا باپ نہیں ہوں۔

''کیا بک رہا ہے۔

ماں اور بیٹے کے درمیان باتیں ہوتے ہوئے دیکھنے کے درمیان ہی میری

نظریں کرن کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

''ریئلی ممی! میں غلط نہیں بول رہا ہوں۔

اس سے پہلے کہ وہ یا میں سمیر سے کچھ کہتے کرن کی بے ساختہ ہنسنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ سب ہی نے متحیرانہ انداز میں اسے دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے سمیر کو مخاطب کیا:

''سچ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنے کو منواتا بھی ہے۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

''دیکھئے، اب تک میں نے کچھ نہیں کہا۔ جو کہا آپ نے کہا اور جو مسئلہ آپ کے اور میرے درمیان تھا، اس کے آپ نے خود ہی دو گواہ بھی بنا لیے۔ کیا آپ اب بھی محسوس نہیں کر رہے کہ آپ غلطی پر غلطی کر رہے ہیں؟

''تم کہنا کیا چاہتی ہو بہو؟

میں نے کرن کو مخاطب کیا تو اس نے اپنی سوالیہ نظریں سمیر پر مرکوز کر دیں۔ دونوں کی نظریں ملیں اور سمیر کے جھکے ہوئے سر نے ہمیں یہ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ خطا کرن کی نہیں ہے۔ میں نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ یہ بول اٹھیں:

''سچ کیا ہے؟ نو مہینے بعد پتہ چل ہی جائے گا۔ تم کیوں اسے دہکتے ہوئے انگاروں پہ لوٹنے پر مجبور کر رہے ہو؟

ہم سب ہی نے جواب میں پھر کرن کی ہنسی سنی۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اور کھانا چھوڑ کر کرسی سے اٹھ گئیں۔

''اچھا تو یہی ہوگا ڈیڈی کو پورا مسئلہ بتا دیں۔

کرن ان کی اور اپنی پلیٹیں ٹرالی میں رکھنے کے بعد کھڑی ہوئی اور ٹرالی ڈھکیلتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔ ہم باپ بیٹوں نے آگے پیچھے اپنی

اپنی بیوی کو خوابگاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ پھر ہماری نظریں ملیں، پل بھر میں ایک فیصلہ شاید ہم دونوں ہی نے کیا تھا۔ کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا، پہلے سمیر میرے بیڈروم کی طرف بڑھا پھر میں بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے سمیر کو اپنی رائٹنگ میز پر کچھ لکھتے ہوئے پایا۔ بس پل بھر کے لیے اسے لکھتے ہوئے دیکھ کر میں رکا تھا اور جونہی میں نے بیڈ کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا تو دیکھا سمیر نے قلم میز پر رکھنے کے بعد کاغذ کا ایک پرزہ اُٹھایا اور اسے پھر وہیں رکھنے کے بعد دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آگے بڑھ کر وہ پرزہ میں نے اٹھا کر پڑھا۔ اور تیزی سے خواب گاہ کے باہر نکلا۔ سمیر ہال میں نہیں تھا، مگر اس کے بیڈروم سے اس کی ماں کی آواز آرہی تھی:

''میں تمہاری چپ کا راز جاننا چاہتی ہوں!

''میں بتاؤں۔ خطا کار ہمارا سمیر ہے وہ ''گے''.....

'' جان چکی ہوں اور اب کرن سے جاننا چاہتی ہوں کہ وہ اب تک خاموش کیوں رہی؟

''اور کیا کرتی ؟ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں اپنے ماں باپ کی میں چوتھی بیٹی ہوں۔ ہماری ہتھیلیوں پر مہندی کی سرخی دیکھنے کے لیے ان کے پورے کے پورے وجود زرد ہو چکے تھے۔ منہ کھولنے یا زبان ہلنے سے ان میں سے کسی ایک کا کھوٹا یقینی ہوتا اور..... مسئلہ تو حل کیا ہوتا البتہ مسئلے پیدا ہوتے ہی رہتے۔ لیکن خود آپ کے بیٹے اور ان کی آنے والی اولاد نے بات کھول دی۔ رہا مسئلہ، تو ممی مسئلہ تو مسئلہ ہے ایک میں انیک.....

''اف۔فوہ.....!!

○○

پٹ بیجنا

جمعہ کے خطبے میں امام نے جملہ ادا کیا تو مسجد کے ہال وصحن میں موجود لوگوں میں سے زیادہ تر نے اس طرح منھ بنائے جیسے پوکھرن کے ایٹمی دھماکے کے جواب میں چاغی میں ہوئے دھماکوں کے کارن دُنیا بھر کے سیاست دانوں کے بنے تھے۔ جمعہ پڑھنے کے ارادے سے آنے والے وہ حضرات جو حوض کے گرد یا نلکوں کی قطار کے سامنے چھوٹے چھوٹے ماربل

کے مکعب پہ بیٹھے وضو بنا رہے تھے، اُن میں سے بیشتر کی ترتیب بھی اک ذرا سے توقف کے باعث متاثر ہوگئی۔ کسی نے داہنی سمت مکعب پہ بیٹھے وضو کرتے فرد کو دیکھا، کسی نے بائیں طرف او رجنہیں پیش امام کا جملہ کچھ زیادہ ہی ناگوار گزرا، اس نے دو چار مرتبہ کھکار تھوک کی پپڑی کو سینے سے دہن میں منتقل کیا اور پھر زوردار آواز کے ساتھ نالی میں انڈیل بھی دیا۔ مسجد کے دفتر میں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ٹرسٹ کے ممبران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں مچلتے اپنے اضطراب کو ظاہر کیا تو کسی نے لاعلمی میں شانے اُچکائے اور کسی نے بالائی ہونٹ کو نچلے پہ دبانے کے بعد گلے کی نسوں کو اوپر کی طرف کھینچنے کی کوشش کی، مگر.....

مسجد سے باہر اپنی ہیرو ہونڈا بائک کو کک مارتا یوگندر موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ ہونے کے باوجود اگلی کک نہ لگا سکا، اس نے پاس ہی کھڑے اپنے بچپن کے دوست منظور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ تیرا پرابلم نہیں ہے یار! جا گھر جا۔ انکل آنٹی تیری راہ دیکھتے ہوں گے۔

پیڈل پہ پیر رکھنے کے بعد یوگندر نے دوست کو دیکھتے ہوئے سوچا: یہ .....کیا بول گیا، اسے خود معلوم ہے؟ یہ اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے وہ سب کیوں نہیں دیکھ رہا ہے جو مجھے نظر آجاتا ہے۔ یہی حال اس کے کانوں کا بھی ہے۔ منظور نے دیکھا پیڈل پر پیر رکھنے کے بعد بھی یوگندر نے کک نہیں لگائی تو وہ آگے بڑھا اور اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے بولا:

''ارے! جانا یار..... ہر جمعہ کو نماز سے پہلے مولوی صاحب لیکچر دیتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں آجاتا ہے، کبھی نہیں، لیکن زیادہ تر سمجھ میں نہیں آتا رے۔ سچ بولوں۔ آج نماز بعد مولوی صاحب کی کھنچائی ہونے والی ہے۔ وہ کیا بول گئے؟ ان کو خود بھی نہیں معلوم۔

سیانا ہے۔ یوگندر نے دل ہی دل میں اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے کک لگائی۔ بائک اسٹارٹ ہوتے ہی وہ سیٹ پر بیٹھ گیا اور دائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبا ایکسی لیٹر زیادہ ہی گھمادیا۔ انجن چیخا تو سائلنسر نے خوب سادھواں اگل دیا۔

مسجد میں خطبہ جاری تھا، صف درصف بیٹھے لوگوں میں سے زیادہ تر کے دلوں میں بخارات بھی اٹھ رہے تھے، ان میں سے کسی نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو کسی نے دیوار پہ آویزاں کلاک پہ نظر ڈالی۔ خطبہ تمام ہوا اور چند ہی لمحوں بعد نماز شروع ہوگئی۔ نماز کا اختتام بالکل ہی غیر روایتی ہوا تھا۔ پیش امام جب آخری سلام پھیر رہے تھے، تب ہی محراب میں دائیں طرف لڑھک گئے۔ اگلی صف کے کچھ نمازی تیزی سے ان کی طرف بڑھے، کسی نے نبض دیکھی کسی نے ان کے چہرے پہ بہتے پسینے کو دیکھنے کے بعد محراب کی چھت میں ٹنگے پنکھے کو دیکھا اور ایک حساس ترکالر مائک پہ اعلان کردیا:

" نمازیوں میں جو بھی ڈاکٹر صاحب ہوں فوراً محراب کے پاس پہنچیں۔ امام صاحب بے ہوش ہوگئے ہیں۔ نمازیوں کے مجمع میں کئی معالج تھے۔ سبھی صفوں سے نکل کر آگے بڑھے، کسی نمازی نے مسجد کے صحن میں موجود شربہ سے ایک گلاس پانی لے کر محراب کی طرف بڑھایا۔ پیش امام کو ڈاکٹرز گھیرے ہوئے تھے۔ اللہ کے ایک بندے نے تعقیبات کا آغاز کیا۔ اسی دوران دو ایک معالجوں نے انہیں بغور دیکھنے کے بعد سرگوشیوں میں تبادلۂ خیال کیا اور پھر لوگوں نے ان میں سے تین کو امام صاحب کو ہاتھوں پہ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو سب ہی کھڑے ہوگئے۔ جن دلوں میں نماز شروع ہونے سے پہلے غیظ کے بخارات اٹھے تھے ان پر وسوسوں کی اوس پڑنے لگی۔ ان میں سے ایک دو نے زیرلب بڑبڑا کر بخارات کو نکلنے کا بھی موقع دے دیا۔

نمازی تو مسجد سے بعد میں نکلے۔ پیش امام کے گرنے اور بے ہوشی کی خبر

پہلے نکل چکی تھی۔ یکے بعد دیگر مسجد کے آس پاس کی مساجد، ان کے متولیان اور اُن مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کو بھی اس کی اطلاع مل چکی تھی۔ مغرب تک یہ خبر بھی لوگوں نے سنی، پیش امام آئی سی یو میں اب تک بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ پچاسوں طرح کی طبی جانچ کی منزلوں سے ایک بے سدھ وجود گزر چکا ہے۔ اگلے دن اُردو کے اخبار میں چند سطروں کی خبر چھپ گئی۔ مسجد کے ٹرسٹیز کی طرف سے اخبار کے قارئین سے درخواست کی گئی تھی کہ دل کی گہرائیوں سے مولوی صاحب کی جلد صحت یابی کی دُعائیں طلب کی جائیں۔

اُردو اخبار پڑھے کچھ طالب علموں کے توسط سے یہ خبر یونیورسٹی بھی پہنچی، جب اپنے ایک ساتھی کی زبانی یوگندر نے سنا تو منظور کے پاس پہنچ کر اس نے تفصیل جاننی چاہی۔ منظور نے اس پہ اچٹتی سی نظر ڈالی اور یہ بھی بتادیا کہ وہ ابھی تک آئی سی یو میں ہیں اور ڈاکٹرز انہیں اب بھی چیک کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

دوسرے روز اتوار کی صبح یوگندر کو اپنے دروازے پر دیکھ کر منظور حیران ہوا۔ اس سے زیادہ حیرت اس کے والد کو ہوئی تھی اور جب منظور کی ماں اس کے سامنے چائے کی ٹرے رکھ رہی تھیں تب منظور کے والد نے اپنے تحیر کو زبان بھی دے دی۔

''تم کیوں دلچسپی لے رہے ہو؟

'' کیوں، اسے اس کا حق نہیں ہے کیا؟

یوگندر کی آنکھوں میں ادھر ادھر بھٹکتے دیدوں کو دیکھنے کے بعد ماں نے پوچھا تو یوگندر کی آنکھوں کے ڈھیلے تھمے۔

'' اس میں بات حق کی نہیں، آج کے ماحول کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یوگندر کی سوچ اس لائن پہ نہیں چل رہی جس پہ اوروں کی چل رہی ہے۔ جس پر ہمیں زیادہ تر چلتے دکھائی دے رہے ہیں۔

''ایسا ہو کیوں رہا ہے انکل؟

یوگندر نے آہستگی سے معلوم کیا تو جواب دینے کے بجائے میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ منظور نے ٹرے سے چائے کی پیالی اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے چائے پینے کی تلقین کی تو یوگندر اس پہ ایک نظر ڈالنے کے بعد سامنے صوفے پر بیٹھے میاں بیوی کو دیکھنے لگا۔ دونوں ہی نے اس کی آنکھوں میں براجے سوال کو ڈیرا لگاتے دیکھا تو منظور کی ماں نے اس سے پوچھا:

''تمہاری ممی ڈیڈی بھی اسی طرح سوچتے ہیں؟

جواب میں یوگندر کا اثبات میں ہلتا ہوا سر دیکھنے کے بعد انہوں نے اسے پھر مخاطب کیا:

''کیا کہتے ہیں وہ؟

''ان کا کہنا ہے آپس میں باتیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے کا لٹریچر پڑھیں۔ اس سے ہمیں ایک دوجے کی سنسکرتی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

''منظور تمہارے گھر جاتا ہے؟

اب کی بار، سر کے بجائے یوگندر کی پلکیں مندیں تو اس کے ماں باپ کے ذہنوں کے دریچے کھل گئے۔ پچپن یا چھپن برس پہلے دروازے ایک دوسرے پہ بند ہونا شروع ہوئے تھے۔ ایک نے دوسرے پر کیے تھے یا کسی اور نے۔ اس پہ تو کسی نے سوچا ہی نہیں، بس وہ تو اور کو خطا وار قرار دے رہے تھے اور جسے وہ خاطی قرار دے رہے تھے وہ تو خود ان ہی سے ڈرنے کے بعد اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتے منظور ان سے مخاطب ہوا:

''افوہ.....آپ دونوں بھی کیسے سوالات کرنے لگے۔

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا، فون بول اٹھا۔ منظور کے ڈیڈی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور سب نے دیکھا دوسری طرف سے کچھ

سن کر ان کے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بعد انہوں نے ریسیور کریڈل پہ رکھا تو سب ہی کی سوالیہ نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔

''امام صاحب کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں۔ انہیں ہوش آ گیا ہے، انہوں نے بتایا میں اپنے طور پر علاج کروا رہا تھا۔

اسی دن مغرب کی نماز کے فوراً بعد قائم مقام پیش امام نے نمازیوں کو صورت حال سے آگاہ کیا تو تاسف کی ملی جلی آوازیں، ہمدردی کے کچھ جملے مسجد میں گونجے۔ نوافل کی ادائیگی کے بعد کچھ نمازی مسجد سے ملحق دفتر میں پہنچے اور منتظمین کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلانے کے بعد رخصت ہو گئے۔ تین چار روز بعد اسپتال سے ملنے والی خبروں سے پتہ چلا: پیش امام کے دونوں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور فی الحال فوری طور پر ایک گردے کی تبدیلی لازم ہے۔ ساری باتیں متولیان کے سامنے رکھنے کے بعد ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں موجود رقم کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔

''وہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ جو صاحب حیثیت ہیں وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

چار ہی دنوں میں ٹرسٹیز کے سامنے اس سے بھی بڑا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ کسی اسپتال میں مطلوبہ نوعیت کا گردہ نہیں تھا۔ منتظمین کی طرف سے اخبار میں اعلان، اشتہار کی صورت میں چھپا تو سب سے زیادہ دکھ منظور کو ہوا۔ حالانکہ اعلانات کے کالم میں بھی وہی مضمون چند سطروں میں موجود تھا۔ شام کو وہ گھر پہنچا تو باپ کی زبانی معلوم ہوا مسجد میں کچھ جوان آئے تھے جن میں صرف ایک بلا معاوضہ گردہ دینے پر آمادہ ہوا۔

''اور دوسرے؟

منظور کے لہجے کا تحیّر باپ کے ساتھ ماں کی آنکھوں کو پھیلانے کا

سبب بن گیا۔

''اوروں کو معاوضہ چاہیے۔

''لعنت ہے ڈیڈ۔

''نہ.....نہ.....لعنت نہ بھیجو۔

'' آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ایک آدمی موت کے منہ میں پڑا ہے اور ہمارے بھائیوں کو روپیہ چاہیے۔

''ہاں بیٹے۔ انہیں پیسہ چاہیے۔

''امام صاحب کو ہم گردہ نہیں دے سکتے اور آپ ایسوں پر لعنت بھیجنے سے منع کررہے ہیں۔

''ہاں چاند۔ وہ تین تھے۔ پریشان حال بیکار جوان۔ایک کے گھر میں مفلوج باپ پڑا ہوا ہے، تین جوان بہنیں ہیں، ان کے رشتے آرہے ہیں مگر جہیز اتنا مانگا جارہا ہے کہ..... سمجھ رہے ہو نا تم؟ دوسرے کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے اور اسے حل کرنے کی خاطر دوسال سے اس کا باپ غائب ہے۔ تیسرے کی روداد حد درجہ افسوس ناک ہے، اس کے گھر میں بھی دوجوان بہنیں ہیں، باپ شرابی ہے، ماں دن بھر غائب رہتی ہے، ایک بہن اب تک دو بار ابارشن کرواچکی ہے لیکن اسے چاہنے والا اب بھی شادی پر تیار نہیں۔ دوسری بہن کی شادی کا مسئلہ حل ہوگا لیکن وہاں بھی جہیز کا مسئلہ مکان کی ضرورت کی صورت میں موجود ہے۔

کال بیل کی آواز پر منظور ہی نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ مسجد کے ایک ٹرسٹی کے ساتھ ایک جوان کھڑا ہوا تھا، کمرے میں داخل ہونے کے بعد متولی نے بتایا کہ اس کا بلڈگروپ اور گردہ ویسا نہیں جیسے کی ہمارے امام صاحب کوضرورت ہے۔ میں نے اسے کچھ روپے دے دیے ہیں

اور یہ بھی کہہ دیا کہ اپنے آس پاس او گروپ بلڈ والے کو ڈھونڈے۔

''او گروپ!

منظور کے ہونٹوں سے آواز نکلی تو سب ہی کی تحیر خیز آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔

'' مشکل ہے۔ ہمیں پھر ایڈ دینا ہوگا اور اچھا تو یہ ہے کہ ٹیلی ویژن سے بھی اپیل ٹیلی کاسٹ ہو۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی نکل ہی آئے گا۔

تجویز معقول تھی۔ دوسرے ہی روز ٹی وی سے اپیل ٹیلی کاسٹ بھی ہوگئی۔ او۔ گروپ والے کچھ لوگ اسپتال بھی پہنچے لیکن گردے کی جو ساخت مطلوب تھی وہ نہ ملی۔ اور ایک روز گزر گیا۔

دوسرے دن اسپتال سے فون آنے پر انہیں اطمینان ہوا۔ مسجد کے متولیان اسپتال پہنچے تو منظور کے والد پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کوٹ کی جیب میں سے موبائل نکالنے کے بعد انہوں نے یونیورسٹی فون کیا اور جب منظور اسپتال پہنچا تو اس کی آنکھیں بھی پھٹی رہ گئیں۔ متولیان کے ساتھ یوگیندر بیٹھا ہوا تھا اور سبھی کو آخری رپورٹ کا انتظار تھا۔ رپورٹ کے ساتھ یوگندر کے ماں باپ کو دیکھ کر بھی سب ہی حیران ہوئے۔ منظور نے آگے بڑھ کے سب کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ متولیوں نے تحسین آمیز نظروں سے تینوں کو دیکھا پھر ان میں سے منتظم اعلیٰ نے سب سے کہا:

'' آپریشن کل صبح ہوگا۔ آیئے، اس جوان کو مولوی صاحب سے ملائیں۔

انہیں اپنے ساتھ لے کر جب وہ پیش امام کے کمرے میں پہنچے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد نوید سنائی تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ڈھیروں تسلی بھرے فقرے سن لینے کے بعد پیش امام نے غور سے ایک ایک چہرہ دیکھنا شروع کیا اور جب ان کی نظریں یوگندر کی ماں پر رکیں تو خود ان

کی اپنی آنکھوں میں ایک سوال لہرایا، جسے ہر متولی نے دیکھ لیا۔

''آپ کچھ.....''

''یہ محترمہ کون ہیں؟

''یہ..... یہ یوگندر کی ممی ہیں مولوی صاحب.....

منظور نے جواب دیا تو پیش امام کے چہرے کے نقوش متغیر ہونا شروع ہو گئے۔

''مجھے یہ گردہ قبول نہیں۔

پیش امام کے فیصلے نے یوگندر کی ماں کا دل توڑا، باپ کے ذہن کو جھنجھوڑا اور خود یوگندر کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے پہلے تو اوروں کو اور آخر میں منظور کے ڈیڈی کو دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اب خود ہی پیش امام سے بات کرے لیکن اس نے سنا، ماں ان سے مخاطب تھی:

''ہم آپ کے فیصلے کو پرنام کرتے ہیں، میں جانتی ہوں آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟

''بات صرف وہ نہیں جو آپ نے سوچی ہے۔ میں دوسری طرح سوچتا ہوں بہن! یہ جسم، اس کا ہر حصہ ہمارا ہونے کے بعد بھی ہمارا نہیں ہے۔ اس پہ ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ یہ پیدا کرنے والے کی امانت ہے۔ ہمیں اسی کو لوٹا دینا ہے۔ پیوندکاری کے حق میں نہیں ہوں میں۔

''کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ آپ آج بھی ہزار سال پہلے کی دُنیا میں جی رہے ہیں۔

منظور سے برداشت نہ ہوا تو اس نے کچکچاتے ہوئے ان سے کہا۔ متولیان نے پہلے تو اسے حیرت سے دیکھا۔ تحسین واحترام کی ملی جلی کئی نگاہیں پیش امام پر بھی پڑیں اور پھر ان کی سوالیہ نظریں منظور کے باپ پر پڑیں۔ اس

سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا پیش امام نے مضمحل سی آواز میں منظور سے کہا:

''تمہاری سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آئے گا۔

''کیوں نہیں آئے گا.....؟ آجائے گا مولوی صاحب! ضرور آجائے گا۔ پہلے آپ یہ بتائیں: آپ کے کپڑے میں کھرونچ آجائے۔ کسی کیل میں پھنسنے کے بعد پھٹ کر کپڑا الگ ہوجائے تو آپ اسے رفو نہیں کروائیں گے؟ پھٹے ہوئے ٹکڑے کی پیوندکاری نہیں کریں گے؟

سب ہی نے حیرت سے منظور کی بات سنی۔ یوگندر اور اس کے والدین نے تحسینی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ دوایک ذہنوں میں اک یاد نے انگڑائی لی لیکن ماحول کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے انہوں نے فی الحال اسے بھلا دینا ہی بہتر جان کر اپنی سوالیہ نظریں مولوی صاحب پر مرکوز کردیں۔ انہوں نے دیکھا: سفید چادر پہ پڑے زرد سے وجود کے زرد تر چہرے کے سکڑے سمٹے دہانے پر ایک تھکا ہوا تبسم بھی ہے اور اس سے اک ذرا سے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے دو کنوؤں میں پانی بس اُبلا چاہتا ہے۔

''بات کچھ اور بھی تو ہے۔

پیش امام صاحب نے آہستہ سے منظور سے کہا۔

''میں کچھ بول سکتا ہوں صاحب؟

پہلی مرتبہ یوگندر کی آواز پر سبھی چونکے۔ وہ کس سے مخاطب تھا کوئی نہ جان سکا۔ سب ہی کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

''میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟

یوگندر نے پیش امام کو مخاطب کیا۔ انہوں نے پلکیں میچ کر اجازت دی تو یوگندر نے کہا:

''ایک دن .....شاید وہ فرائڈے تھا جب میں منظور کے ساتھ اس کے گھر

گیا، اسے چھوڑنے، اور آپ مسجد میں اسپیچ دے رہے تھے.....

کچھ ہی دیر پہلے دو ایک ذہنوں میں جس یاد نے ایک انگڑائی لی تھی وہ پھر کسمسائی، انہوں نے سنا، یوگندر کہہ رہا تھا:

''گالوں پہ موجود داڑھی، پیشانی پر نظر آنے والے گٹے اور رمضان میں منھ سے نکلتی ہیک کا نام اسلام نہیں ہے۔

حیرتیں پیش امام ہی نہیں سبھی کی آنکھوں سے اُبلنے لگیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس سے پہلے کوئی کچھ کہتا یوگندر نے بات آگے بڑھائی:

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور داڑھی رکھنے سے آدمی پرفیکٹ مسلمان نہیں ہوتا۔ میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں پرفیکٹ مسلمان کیسا ہوتا ہے؟

''آپ نے کتابیں پڑھی ہیں؟

پیش امام نے یوگندر سے پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''میں اور منظور کتابیں ہی تو پڑھتے ہیں صاحب۔ میں نے تو آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے، پر مجھے ابھی جواب نہیں ملا!

''یوگیہ۔

باپ نے بیٹے کوٹوکا تو پیش امام نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کیا اور یوگندر سے مخاطب ہوئے:

''خطبے کا جو ٹکڑا آپ نے سنا، وہ ہماروں کے لیے بہت ہی کڑوا، کسیلا ہے، ہم وہی تو کر رہے ہیں۔ اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ بس یہی ہے اسلام۔ سچ پوچھیں تو..... بہت چھوٹا ہے اسلام۔ لیکن جان لیں تو بہت ہی بڑا ہے۔ داڑھی رکھنے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے ہی ہم اچھے نہیں ہوں گے۔ اللہ کا کوئی بندہ ہمارے آس پاس بھوکا رہ جائے۔ اگر کوئی برہنہ رہ جائے، ہم اپنے علم پر اترائیں

اور جن کے پاس نہیں ہے اس کو مذاق کا نشانہ بنائیں۔ وہ سب ہی کو سب کچھ نہیں دیتا ہے۔ جنہیں دیتا ہے ان سے کہتا ہے اوروں کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ میں نے تمہیں علم دیا ہے۔ طاقت دی ہے۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر نہیں ہے یہ تمہارے اپنوں کا حق ہے۔ اسے حقوق العباد کہتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی پوچھا تھا۔ آپ نے کتابیں پڑھی ہیں، اسی لیے معلوم کیا تھا، ایک جملے میں تمہارے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ پر کچھ آپ کی اور کچھ میری مجبوری ہے جو مجھے مثالیں دینے پر مجبور کر گئی۔ اور وہ بھی ڈھنگ سے نہ دے سکا۔

کمرے میں پل بھر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ بس سب کی سانسیں بول رہی تھیں۔ کیا بول رہی تھیں؟ کوئی بھی نہ سمجھ سکا، چند لمحوں بعد یوگندر بولا تو سب کی سمجھ میں اس کا سوال آ گیا:

''ایک جملے میں آپ کا جواب کیا ہوتا؟

''بندے کا حق۔

''میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب میں یوگندر نے خاموشی پائی۔ کنکھیوں سے اس نے سب کو دیکھا پھر ایک دم ہی اسے یاد آیا کہ کچھ ہی دیر پہلے پیش امام صاحب نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے ایک شبد پر زور دیا تھا۔ فوراً ہی اس نے انہیں مخاطب کیا:

''میرا آفر آپ کو اس لیے قبول نہیں کہ میں یوگندر ہوں؟

''جی۔

مختصر ترین جواب سن لینے کے بعد پہلے تو یوگندر نے اپنی ماں کو دیکھا، پھر باپ کو اور اس کے بعد مسکراتے ہوئے پیش امام سے کہا:

''اگر میرے مسلمان ہو جانے سے آپ کی جان بچ جاتی ہے تو میں تیار ہوں۔ آپ کلمہ پڑھوایئے۔

بڑے ہی رسان سے ایک فقرہ ادا ہوا تھا، ایٹمی دھماکہ پوکھرن میں ہوا یا چاغی میں؟ پتہ ہی نہ چلا۔ سب کی آنکھوں میں دھواں ہی دھواں تھا۔ سیاہ، گاڑھا، آگ تھی جو دو دلوں میں دہک رہی تھی، دھماکے کی گونج سے سب ہی کے درِ سماعت بند تھے، یوگندر کچھ کہہ رہا تھا اور جمعہ مسجد کے پیش امام اسلام الدین کی آنکھیں کچھ سن رہی تھیں۔

○○

انگبولا

''کہنا تو بہت کچھ ہے سمتا! پر.....سمجھ میں نہیں آتا کہوں تو کیسے، کن شبدوں میں؟

پھر تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے دیکھا، سمیتا نے اپنے بلاؤز کے ہک کھولنے کے بعد اپنے پستان بَرا سے آزاد کر دیے ہیں، دائیں بائیں دونوں طرف داغے جانے کے چھوٹے چھوٹے گول گول کئی نشانات موجود تھے۔

اس نے چاہا اپنی پلکیں میچ لے یا کم سے کم کچھ مرتبہ ہی سہی انہیں جھپکائے۔ ابھی چاہت عمل کے دائرے کو الانگ بھی نہ پائی تھی کہ اس نے سنا:

''دیکھ رہی ہے؟ دیکھ انہیں دیکھ۔ یہ..... ہرین کی دین ہیں۔

''ہرین؟

سمتا نے حیرت سے اس کے پتی کا نام لیا تو سمیتا کی آنکھیں بول اٹھیں اور جب ان آنکھوں نے دیکھا، سمیتا کی آنکھوں میں بے یقینی کی دھوپ ہنوز موجود ہے تو اس نے اپنی پلکوں کے پٹ اک دم سے بند کر لیے۔ سمتا نے دیکھا، سمیتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر لکیریں کھینچتے ہوئے ٹھوڑی کے دائیں بائیں سے ٹپک کر اس کے کالے برا میں جذب ہو چکے تو وہ اس سے بولی:

''وہ..... وہ تو..... ایسا نہ تھا۔ بہت چاہتا تھا تجھے، کالج کے زمانے سے، خود تو نے مجھے بتایا تھا۔ سب کچھ رسان سے کرنے کا عادی ہے۔ جی کرتا ہے میرے دماغ کی کسی نس میں سلگنے والی آگ پورے شریر میں بھر جائے۔ مجھے یا دہے۔ تو نے کہا تھا..... پر میری یہ چاہت بھی دھیمے دھیمے جلتی آگ میں چپکے سے جل کر راکھ ہو جاتی ہے..... یہی کہا تھا نا تو نے؟

سہیلی کے استفسار پر سمیتا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کو سنبھالا اور بلاؤز درست کرنے لگی۔ آخری ہائی میں ہک کو ٹھونستے ہوئے اس نے دیکھا، سمتا پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے۔ ساری کا پلو شانے پر ڈالنے کے بعد ہاتھ بڑھا کر اس نے سمتا سے گلاس لیا اور تین چار گھونٹوں میں پانی پینے کے بعد خالی گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے اس نے چاہا، سمتا اس سے پوچھے، ہرین نے یہ ستم کیوں ڈھائے؟ مگر وہ تو چپ بیٹھی ہے۔ اپنے چہرے کو اک ذرا سا ترچھا کر رکھا ہے۔ دیکھ تو مجھے ہی رہی ہے، پر یہ کون سا طریقہ ہے، یہ..... یہ

اک دم سے اسے کیا ہوگیا؟ ابھی تو مجھ سے ہرین کے بارے میں باتیں کررہی تھی۔ اس کے ویوہار کی تبدیلی پہ حیران ہو رہی تھی۔ اک دم سے اس نے چپ کیوں سادھ لی؟

''تیری چپ.....مجھ سے کچھ بول رہی ہے سمتا۔

''چپ کی زبان سمجھتے ہی کتنے ہیں؟

''بولے تو؟

''سچ کہتی ہوں سمیتا۔

''کیا مطلب؟ صاف صاف بول۔

''زبان ہلائی تو.....جو کچھ پایا ہے وہ بھی کھودوں گی۔

سمیتا نے سمتا کو غور سے دیکھنے کے بعد اپنی پلکوں کو ذرا سا میچا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ دونوں سہیلیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر سمیتا بولی:

''تو کیا سمجھتی ہے، چپ رہنے میں ہمارا بھلا ہے؟

''تیرا ہو نہ ہو، میرا تو ہے۔

''کچھ تو بول سمتا۔

''کچھ سچ بولے نہیں، دیکھے جاتے ہیں اور ستیہ تو یہ ہے انہیں کیول دیکھ لینے سے بھی کام نہیں چلتا۔

''تو.....آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟

''بوڑھے بلاؤ کو چھچھوندر سے کھیلتے دیکھا ہے؟

سمتا کی بات سن کر سمیتا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دونوں ہی سکھیوں نے پھر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر سمتا نے دیکھا سمیتا نے اپنا رخ بدلا اور سلائڈنگ کے پردے دائیں بائیں کھینچ دیے۔ اس نے دیکھا نریمان

پوائنٹ کا سمندر بھی شانت ہے۔ آج سے پہلے جب کبھی سمیتا کے ساتھ اوبیرائے آئی تھی، سمندر کو چیختے چلاتے ہی دیکھا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا سمندر سے زیادہ زور سے کنارا بولتا ہے اور اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں ٹیٹراپوڈ بولتے ہیں۔ تین زبانوں والے سمنٹ کے ٹیٹراپوڈ جنہیں ساحل کے تحفظ کے لیے بلدیہ والے کناروں پہ ڈال گئے۔ ان میں کتنے ہرین ہوں گے؟ کاش میں ان ٹیٹراپوڈوں میں اُتر کر دیکھوں..... دیکھ بھی سکوں گی؟ اس نے سوچا، اس سے پہلے کہ کچھ اور سوچتی اسے سمتا کی بات یاد آ گئی:

''بوڑھے بلاؤ کو چھچھوندر سے کھیلتا دیکھا ہے؟

سمتا کی بات یاد آتے ہی اس کے اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اس نے محسوس کیا فرحت بخش ہوا غلطی سے کمرے میں در آئی ہے۔ پل بھر کے لیے اس نے آنکھیں بند کیں اور ایک لمبا سانس کھینچ کر پلکوں کے کواڑ ہی نہیں ہونٹوں کے در بھی کھول دیے۔ اس نے دیکھا سمتا اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اسے لگا اس کی بچپن کی سہیلی اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پر کہنے کی خاطر ابھی فیصلہ نہیں کر پائی ہے۔ خود اسی نے اسے مخاطب کیا:

'' کچھ کہنے کی سوچ رہی ہے؟

سمتا نے پلکیں میچ کر اثبات میں صرف ایک مرتبہ سر ہلاتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہرین اور بوڑھے بلاؤ میں فرق ہے سمیتا! میری مان، خاموشی سے کچھ دن تھوڑے سے چٹکے اور کھالے اور دیکھتی جا، تیرا ہرین اب اور نیا کیا کرتا ہے؟

''سمتا! جانتی ہے تو کیا کہہ رہی ہے؟

سہیلی کے لہجے کی تبدیلی پر سمتا نے اس کی بات کے جواب میں کہا:

'' اچھی طرح جانتی ہوں بہن! اور یہ بھی جانتی ہوں میری بات تجھے

بُری لگے گی۔

''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟

'' جو گزر چکا اس میں کیا کچھ تھا؟ ہم اس پہ سوچتے ہی کہاں ہیں۔ جو گزر رہا ہے بس اسی کے بارے میں سوچتے ہیں اور اچھا، بس اچھا یا بہت اچھا ہونے کی کامنا نے ہمیں ہماری اپنی چیزوں پر سوچنے ہی نہیں دیا ہے۔

''کیسی باتیں کرنے لگی ہے سمتا؟

جواب میں سمیتا نے سمتا کے ہونٹوں کو مسکراتے دیکھا تو اس کے اپنے دماغ کی کسی رگ میں اک دم سے کھد بد ہونے لگی اور پل بھر میں اس کے اثرات اس نے اپنی کنپٹیوں میں محسوس کرنے شروع کیے۔ ایک لمبا سانس کھینچ کر اس نے معنی خیز نظریں سمتا پہ مرکوز کرتے ہوئے اپنے منہ سے ہوا خارج کر دی۔ وہ خود سمتا سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کنپٹی میں ہوتی دھمک اسے روک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کہنے کی خواہش اور نہ کہہ پانے کی مجبوری میں لرزنے لگے۔ سمتا بھاکرے نے اپنے چہرے کو اک ذرا سا دائیں طرف موڑ کر سمیتا کے کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھا اور اس سے مخاطب ہوئی:

'' سچ کہتی ہوں سمیتا! میں نے جو کچھ کہا ہے اپنے پہ کچھ بیت جانے کے بعد ہی جانا ہے۔ تو میری سہیلی ہے۔ کے۔ جی سے کالج تک ہم ساتھ رہے۔ آج بھی ہم ساتھ ہیں۔ بس کچھ دنوں کے لیے ہم میں دوری آئی تھی۔ جب میرا لگن ہوا، میں سہاگن ہوئی، میں نے جانا سب ہی کچھ مجھے مل گیا ہے مگر سکھ بھرا موسم میرے گھر غلطی سے چلا آیا تھا۔ یہ کس طرح چلے گئے۔ تو بھی جانتی ہے اور وہ بھی جو انہیں جانتے تھے۔ لیکن انہیں پانے اور کھونے کے بعد جو بھی میں نے جانا ہے وہ سلیبر کے کورس میں کہیں نہیں ہے۔ وہ تو وہاں بھی مجھے نہ ملا جہاں سے بہت کچھ اشاروں میں سرگوشیوں میں ہر لڑکی پاتی ہے۔ ابھی، جو بھی تو نے مجھے دکھایا

ہے، ویسا کچھ مجھ پہ نہیں گزرا۔ پر تیرے سے پہلے میں بھی ماں بنی ہوں سمیتا۔ ماں بن رہی تھی تب جانا تھا۔ جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا، جس کا فیگر میں بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس پہ صرف میرا اپنا ادھیکار نہیں ہے۔ یہ جب تک جیے اس سے کھیلے، پر ماں بن کر میں نے جانا کہ اس پہ ان کا بھی زیادہ حق نہیں تھا۔ ہرین نے اپنا سمجھ کے اس پہ جو ظلم کیا ہے تو نے اپنے انگ سے اپنی زبان سے کہہ دیا ہے۔ تجھ پہ جو بیتی اسے سن کر میں نے تجھ سے کہا تھا، جو گزر چکا اس میں کیا کچھ تھا؟ اسے جان لینے کی خاطر میری مان، خاموشی سے کچھ دن چٹکے اور.....''

''افوہ!

سمیتا کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر پیر پٹختے ہوئے اس سے کہا:

''بَراہٹا کر دکھا چکی سمتا۔ اور دیکھنا چاہتی ہے؟ ہرین نے کہاں کہاں چٹکے دیے ہیں؟ میرے ذرا سے داغوں نے تجھے لاجیکل باتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں تجھے اپنا جلا ہوا بدن دکھانے نہیں آئی تھی سمتا۔ میں تو تجھ سے مشورہ کرنے آئی تھی۔

''مشورہ؟

''ہاں۔

''کاہے کا مشورہ؟

''جو مجھ پہ بیتی ہے اسے دُنیا کو بتانا ہے۔ پرنٹ میڈیا پہ یہ سچ نہیں آسکتا اور آیا بھی تو کتنے لوگوں تک پہنچے گا۔

''چاہتی کیا ہے؟

''میں..... جو ستیہ میرے ہاتھ لگا ہے اسے دُنیا بھر کو دکھانا چاہتی ہوں۔ ابھی کچھ روز پہلے ہی مجھے ایک کیسٹ ملا ہے اسے دیکھنے کے بعد ہی مجھے پتہ چلا

ہے کہ ہرین میں یہ پری ورتن کیوں ہوا ہے؟ بہت سوچ وچار کے بعد میں تیرے پاس دوڑی آئی۔ اور تو مجھ سے اور چٹکے کھانے کے لیے کہہ رہی ہے۔ تو تو کمپیوٹر انجینئر ہے سمتا اور میری سہیلی ہے۔

پلنگ کے سرہانے سے اپنا پرس اُٹھا کر اس نے اس میں سے ایک ویڈیو کیسٹ نکال کر سمتا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''ان چٹکوں کی لاجک میں کتنے ستیہ چھپے ہوئے ہیں، انہیں دیکھنے پر تجھے پتہ چل جائے گا۔

سمتا نے غور سے اپنی سہیلی کا تمتمایا ہوا چہرہ اور اس کے سرخ رنگ کو اترتے ہوئے دیکھا اور سوچنے لگی، تھوڑے سے چٹکوں نے میری سمیتا کے چہرے سے ساری شادابی چھین لی ہے۔ اور جس پل سمتا اس بارے میں سوچ رہی تھی اس کے اپنے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔ تیرے اپنے جیون سے سہانا موسم گزر چکا ہے۔ کیا کچھ کھویا ہے؟ تو نے تو اپنا سب کچھ کھو دیا ہے، مگر لگتا نہیں۔ میں اس سے کیسے کہوں؟ کہہ تو چکی ہوں، پر اس کے تو پلے ہی کچھ نہ پڑا۔

''کیا سوچنے لگی سمتا؟

''تجھے یاد ہے میں نے ابھی کچھ دیر پہلے کہا تھا، زبان ہلائی تو جو پایا ہے وہ سبھی کھو بیٹھوں گی۔

''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟

''تو تو سمجھ دار تھی سمیتا۔

''تھی۔ اب نہ رہی کہ تیری، تیری طرح میں نے اپنا پتی نہیں گنوایا ہے۔ میں نے ..... اپنا ہرین کھویا ہے سمتا اور تھوڑے سے بچ پائے ہیں۔ وہ اگر دُنیا نے جان لیے تو شاید میرا ہرین مجھے پھر مل جائے۔ یہ کیسٹ اٹھا اور چل کسی سائبر کیفے میں چل کر ایک ویب سائٹ کھولیں۔ True gujrat.com نام

رکھیں گے اُس کا۔ تا کہ دُنیا بھر کو سچ کا پتہ چل جائے گا۔

''بہت معصوم ہے تو بھی۔''

''کیا بول رہی ہے سمتا؟''

''مجھے دیکھ۔ یاد کر..... جو بھی مجھ پہ بیتی اسے یاد کر، اور یاد کر میں نے اپنے سہاگ کے بعد اچھی سی ماں سمان ساس کھوئی ہے۔ تو نے سنا ہوگا میری ساس بیمار تھیں۔ وہ بیمار نہیں تھیں۔ سیدھی سادی عورت کارٹون بنادی جائے تو اچھی بھلی کیسے رہ سکتی ہے؟ اور.....اور یاد کر سمتا، ان کی مرتیو کیسے ہوئی ہے؟

اور سمیتا کو یاد آتا چلا گیا کہ اس کی سہیلی کا پتی کار حادثے میں ختم ہوا ہے۔ کچھ دن بعد وہ عورت بھی چلی گئی جس کا جوان بیٹا کار ایکسی ڈنٹ میں پرلوک سدھارا ہے اور..... اوہ.....اب سمجھ میں آیا سمتا کیوں کہتی ہے، بوڑھے بلاؤ کو چھچھوندر سے کھیلتے دیکھا ہے؟

سمتا نے دیکھا اس کی سہیلی کا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا ہے اور اس کی نظریں ویڈیو کیسٹ پہ ٹھہر گئی ہیں۔ اس نے کیسٹ سمیتا کی طرف بڑھا دیا۔ سمیتا نے کیسٹ اپنے پرس میں رکھتے ہوئے اس سے اپنی واپسی کے متعلق کہا اور پھر سمتا نے دیکھا وہ کمرے سے نکل رہی ہے۔ ٹھیک دو منٹ بعد وہ بھی اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پہ بیٹھی اپنے بنگلے کی طرف جا رہی تھی، اور اس کی دائیں مٹھی میں دبے موبائل کے کچھ بٹن اس کی بائیں ہاتھ کی انگلی یکے بعد دیگرے دبا رہی تھی۔

○○

جگاڑ

اُس قافلے میں میرے جاننے والے اللہ کے دو ہی بندے تھے: ایک میرا دوست شمو، اور دوسرا ٹریول ایجنٹ مہدی حسین اور یہ دونوں ہی اس اَن ہونی پر حیران تھے کہ دونوں ہی جانتے تھے.....

اس رات امی بہت یاد آئیں جب بیٹوں نے ادب سے مجھ کو فریضۂ حج کی ادائیگی کا احساس دلایا۔ بیوی اور بیٹیاں فخر و مسرت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھیں۔

سعید بچوں اور غیور بھائیوں کی خواہش، ماں اور بہنوں کے روم روم سے پھوٹ رہی تھی اور میں ایک دم سے ساٹھ برس پیچھے لوٹ گیا تھا۔

'' بیٹے! تیرے بابا جوان ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو حج کروایا تھا: خود ارادہ کیا تو مجھ سے بھی کہا، مگر مجھے تو بیماریاں دبوچے ہوئے تھیں، وہ اکیلے ہی اللہ کے گھر کی زیارت کر آئے۔ مجھے یاد ہے: جب تیرے دادا دادی حج کر آئے تو ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا تھا:

'' امیر نے حج کروایا ہے تجھے بھی کروائے گا، کسی وجہ سے نہ کروا سکے اور تو جیتی رہی تو یقیناً تیرے بچے یہ فرض پورا کریں گے۔

دادا، دادی وامی کی آرزو اور خود میری اپنی زندگی امی کے بچھڑتے ہی اپنے معنی بدلنے لگی تھی۔ جدوجہد سے بھری زندگی نے جلد ہی مجھے سمجھا دیا۔ آرزو تو اس خواہش کو کہتے ہیں جس کا پورا ہونا محال معلوم ہو: اس کی خاطر کی جانے والی کوشش کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں، اور ہر درجے کا نتیجہ پھر کوشش ٹھہرے۔ مسلسل کوشش اور اس کا حاصل؟ صرف اور صرف تجربے، اچھے، ناخوش گوار تو صرف یادیں ہی ہاتھ لگتی ہیں۔ تلخ، ترش اور بس ذرا سی شیریں۔ حافظ کا کاسہ ہوتا ہے اور اپنی ہی ٹکسالوں کے سکّے ان میں گرتے ہیں۔ فرق بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ چہرے بدلتے ہیں، لوگوں کی طینت تبدیل ہوتی ہے۔ سکے ڈالنے والے کل بھی غیر نہ تھے آج بھی اپنے ہیں۔ اپنے جو اپنے ہی نہ ہو سکے۔ اس رات تو سب ہی اپنے تھے جب بیٹوں نے آپس میں مشورے کے بعد اپنی خواہش کو زبان دی اور مجھے اپنی امی کو یاد کرنے پر مجبور کر دیا: امی کو بھولا ہی کب تھا؟ یہ تو رشتہ ہی عجیب ہے۔ باپ، بھائی، بہن سب کے ساتھ حکایتیں ہیں، روایتیں ہیں مگر ماں تو عجب نعمت ہے، دکھائی دینے کے باوجود نظر نہ آنے والی۔ بس ایک اور ہے جو ہے اور دکھائی نہیں دیتا، کئی صفتیں دونوں میں مشترک ہیں۔ لاکھ بھلانا

چاہو دونوں ہی بے اختیار یاد آتے ہیں۔

''کئی ٹریول ایجنسیاں قافلے لے جاتی ہیں۔ آپ باقریہ والوں سے معلوم کیجیے، ان کے قافلے کی بڑی شہرت ہے۔ چھوٹے بیٹے کے مخاطب کرنے پہ مجھے پھر امی یاد آئیں۔ اثبات میں سر ہلا کر فرزند کو مطمئن کرنے کے بعد بھی میں اپنی امی کو یاد کر رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر یاد کیوں آ رہی ہیں؟ بہت غور کرنے پر دماغ نے کیوں کی کڑیاں ملانی شروع کر دیں تو اک زنجیر بنی اور دل نے اطمینان کی وادی میں قدم رکھا، ذہن نے پھر سوچنا شروع کر دیا: امی، ابو، ان کے والدین، ان کی اپنی تمنا اور اس کی تکمیل کا ذریعہ، پھر امی، دادا، دادی کی باتیں، باتیں کہاں تھیں؟ پیش گوئی تھی جو عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ میری کم سنی میں ہی امی مجھے چھوڑ گئیں۔ ان کی تو کوئی تصویر بھی میرے پاس نہیں ہے، کس سے پوچھوں کیسی تھیں؟ یہی خیال اکثر اپنی بیٹیوں کو دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ تین بچیاں ہیں شاید ان ہی میں کہیں میری امی موجود ہیں۔ امی کے نہ ہونے نے اب تو مجھ ہی کو بڑا بنا دیا ہے۔ اب تو..... اب تو جو ہم سے چھوٹے ہیں وہ اِک دم سے بڑے ہو گئے۔، سوچ، منصوبے اور جدوجہد ادھر منتقل ہو گئے۔ دونوں بیٹے خیال کی طرح آئے اور ایک خواب پلکوں پہ سجانے کے بعد لوٹ گئے۔ باقریہ والوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مجھ سے کہا گیا تھا مگر وہ خود ہی مہدی حسین سے مل آئے تھے۔ میرا پاسپورٹ، تصویریں او رآدھی رقم بھی اس کے حوالے کر دی تھی اور دوسری قسط کی ادائیگی کے طریقے سے بھی اسے مطلع کر آئے تھے کہ روپئے خود ہمارے بابا آپ تک پہنچا دیں گے۔ بیٹوں کی روانگی کے بعد ان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تو فریضۂ حج کی ادائیگی کی تفصیلات اور ان کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے میں نے کتابوں کا سہارا لیا۔ کتابیں جن میں علوم موجود ہیں۔ مجھے بھی اتنا ہی جان لینا چاہیے جو فریضے کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے۔

اس سمندر میں اترا تو حسد کو لے کر ابھروں گا کیونکہ جن کے طفیل دین پایا ہے وہی فرما چکے ہیں۔ ''حسد کے اگر حصے کرو تو نو حصے علم کے ساتھ ہوں گے۔'' کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے تفصیلات اور ان کی نزاکتوں کو سمجھنے کے دوران ہی میرے دوست شمو کا فون آ گیا، وہ شکایت کر رہا تھا:

''یار! تو چاہتا کیا ہے؟ جانتا ہوں نہیں جانتا تو بس اتنا کہ تو کیا ہے، تیری سوچ کیا ہے؟

میں نے شمو سے ناراضگی کا سبب معلوم کیا تو وہ کہنے لگا:

''بھئی! تو پڑوس میں ہو آیا۔ تیرے جانے کی خبر بھی ادھر اُدھر سے ملی اور اب پھر تیری روانگی کا پتہ چلا تو اوروں سے۔ تجھے فون صرف اس لیے کیا کہ ہم بھی باقریہ والے قافلے میں شامل ہیں۔

اس کی بات نے مجھے حیرت سے دوچار کیا۔ یہ خبر اس تک کیسے پہنچی؟ پہلے لوگ کہا کرتے تھے منہ سے نکلی کوٹھوں چڑھی ددھیال ننھیال پہنچی مگر اب کوٹھوں والے مکان کہاں جو بات وہاں چڑھے اب تو منھ سے نکل تاروں پہ قلانچیں بھرتی ہے۔ بیوی، بیٹیاں، بہوئیں: ان میں پیٹ کی ہلکی کون ہے؟

''سن یار! مجھے مہدی کی زبانی معلوم ہوا تم بھی اسی قافلے میں شامل ہو، انہوں نے تمہارے لیے کچھ کتابچے مجھے دیے ہیں اور یہ بھی کہا کہ روانگی سے ہفتہ بھر پہلے ایک جلسہ ہوگا جس میں عازمین حج سے عامل کو متعارف کروایا جائے گا۔ اس جلسے میں تمہاری شرکت بھی لازم ہے اور یہ ذمے داری باقریہ والوں نے مجھے سونپی ہے۔

بات مکمل کرنے کے بعد میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پلکیں میچ کر اطمینان کی سانس خارج کی۔

—O—

چند روز بعد کوریئر کے ذریعے بیٹے کا روانہ کیا ہوا ڈرافٹ مجھے مل گیا۔ چوتھے دن بینک سے روپے نکال کر ٹریول ایجنٹ کو بقیہ رقم کی ادائیگی کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے مکان اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان رفیع نگر نام کی ایک کچی بستی سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بستی ان ضرورت مندوں نے مزبلہ کے گرد بسائی تھی جن کی جیبوں میں پختہ مکان خریدنے کی رقم نہ تھی۔ اسے آباد کرتے ہوئے بھی وہ سب اچھی طرح جانتے تھے: بلدیہ پورے شہر کی غلاظت یہیں ڈھیر کرتی ہے اور کاسموپولیٹن شہر کے لوگ ناک پہ رومال رکھتے ہوئے بھی رفیع نگر کی طرف سے گزرنا گوارہ نہیں کرتے۔ ان دنوں جب برسرکار تھا، خود میں نے بھی اسے دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا کہ تب علی الصباح گھر سے نکلنا ضروری تھا اور وہی وقت بستی کے لوگوں کا حوائج ضروریہ سے فراغت کا بھی ہوا کرتا ہے، کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر کے پاس ہی رفع حاجت کی ادائیگی کو دیکھنے کا یارا مجھ میں نہیں تھا۔

آج تو وقت ہی دوسرا ہے، بینک سے نکل کر چند گلیوں کے بعد ہی مزبلہ کا مقام تھا۔ ایک گلی سے نکلتے ہی دیکھا: کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک عورت مردہ بطخ صاف کر رہی ہے۔ میرے قدم تھمے، اس عورت کو غور سے دیکھا، اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں کچھ دیر کھڑا چادر، عورت اور مردہ بطخ کے بارے میں ہی سوچتا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا تو دیکھا عورت تیزی سے ہاتھ چلاتے بطخ صاف کر رہی ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو کھنکارنے کے بعد میں نے اس سے کہا:

''آپ کی چادر اور آپ کے کام نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔

جواب میں اس خاتون کی خاموشی بولی تو پھر اس سے مخاطب ہوا:

''بی بی! یہ..... یہ مردہ بطخ ہے..... اور کیا یہ بھی کہوں کہ.....

'' جانتی ہوں، مگر..... لگتا ہے آپ نہیں جانتے: انسانی زندگی کے کسی موڑ پر حرام بھی حلال ہو جاتا ہے..... آپ نے دیکھا، رکے، شکریہ..... آپ کہیں جا رہے تھے، جائیں، اپنا کام کریں۔

''چلا جاؤں گا، مگر خدارا پہلے اس بطخ کو چھوڑیے۔

''میں کہہ چکی ہوں..... یہ ہم پر حلال ہو چکی ہے۔

'' آپ..... کہاں رہتی ہیں؟

''ارے بھائی! آپ جہاں جا رہے تھے، چلے جائیں اور مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔

اس بی بی نے بڑے سفاک لہجے میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں تو ہڑبڑا کر رہ گیا، کیسے کہتا: ایجنٹ کو پیسے دینے جا رہا ہوں، بس گم صم کھڑا رہا۔

'' آپ کہاں جا رہے تھے؟

وہی انداز، وہی لہجہ مجھ سے سچ کہلوا گیا تو اس خاتون نے اپنے سر کو اک ذرا سا ترچھا کرنے کے بعد مجھے دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئی:

''فریضے کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ بھی جائیں گے۔ حضور کے دربار میں پہنچیں تو..... عاجزہ کا سلام عرض کیجیے گا اور ان سے کہیے گا، آپ کی اولاد پر حرام بھی حلال ہو چلا ہے۔

اس بی بی کے طرز تکلم میں تحکمانہ ٹھہراؤ کے باوجود جو بے کسی موجود تھی، وہ مجھے زمین میں دھنسنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ قوت برداشت جواب دینے ہی کو تھی کہ میں نے اس خاتون سے کہا:

''بی بی! ان ہی سرکار کا واسطہ، اس بطخ کو پھینک دیجیے اور..... اپنی

افتاد بیان کیجیے۔

''سب کچھ کہہ چکی..... پھر بھی تفصیل جاننا چاہتے ہو، وہ بھی بیان کرسکتی ہوں۔ دو زندگیاں مجھ سے وابستہ ہیں..... اور سوائے پروردگار کوئی سہارا نہیں ہے۔ ہاتھ..... پھیلتا نہیں، کام ملتا نہیں، ایسا بھی نہیں کام ہی نہ ہو، ہے۔ یقیناً ہے مگر کام دینے والوں کی نظریں بہت کچھ کہتی ہیں۔

''اوہ!

تاسف کے اظہار کے لیے میرے پاس ایک ہی لفظ تھا سو ادا ہو گیا اور فوراً ہی یاد آیا کہ اس عورت نے دو زندگیوں کی وابستگی کا ذکر بھی کیا تھا۔

''آپ نے ابھی ابھی دو زندگیوں کی..... ....

''دونوں میری بیٹیاں ہیں اور.....

ذہن میں موجود تمام منصوبے ایک دم سے منہدم ہو گئے۔ ملبے سے کچھ وسوسوں نے سر اُبھارا تو دماغ میں اٹھتا فیصلہ لڑکھڑانے لگا۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے خاتون سے کہا:

''بی بی!..... اٹھیے..... اور اپنی امانت وصول کر لیجیے۔

خاتون نے بطخ چھوڑ کے اپنا رُخ بدلا، غور سے مجھے دیکھا اور اُٹھتے ہوئے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا اور بولی:

''آپ تو حج کرنے جا رہے تھے۔

''اسے وصول کیجیے۔

''لیکن بھائی صاحب.....

میں نے دونوں ہتھیلیوں پر نوٹ رکھے اور سر جھکانے کے بعد ہاتھوں کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بی بی سے کہا:

''دیر نہ کیجیے، برے دَور میں..... ہم غلط جگہ ملے ہیں۔ اسے قبول کر لیجیے۔

''آپ تو حج.....

''آپ نے اسے قبول کرلیا تو میرا حج ہو گیا۔

گو میں سر جھکائے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے تھا اور کنکھیوں سے میں نے دو لرزتے ہوئے ہاتھوں کو اُٹھتے اور گرتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھ کر چادر پر نوٹوں کی گڈی ڈال کر میں تیزی سے گھر کی طرف پلٹ گیا۔

——O——

اس قافلے میں میرے واقف کار اللہ کے دو ہی بندے تھے: ایک میرا دوست شمو اور دوسرا ٹریول ایجنٹ مہدی حسین اور یہ دونوں ہی اس اَن ہونی پہ حیران تھے کہ دونوں ہی جانتے تھے کہ عین وقت پر میں نے مہدی حسین سے معذرت چاہی تھی اور شمو کو بھی اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا تھا مگر شمو اور مہدی حسین کہہ رہے تھے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

مہدی حسین سے ملاقات ممکن نہیں، شمو گھر آئے تو پتہ چلے وہاں کیا ہوا؟

OO

بس اب سو جاؤ، نیند آنکھوں میں ہے کل پھر سنائیں گے
ذرا سی رہ گئی ہے رات افسانے بہت سے ہیں

—— قمرؔ جلالوی

مصنّف کی تصانیف

۱۔ مباہلہ	(ناول)	(۱۹۸۸ء)
۲۔ تین بتی کے راما	(ناول)	
۳ گھٹتے بڑھتے سائے	(افسانے)	۱۹۹۳ء
۵۔ موسم عذابوں کا	(افسانے)	۱۹۹۹ء
۴۔ بساط	(ناول)	۲۰۰۰ء
۶۔ کہی ان کہی	(افسانے)	۲۰۱۲ء

رابطہ :

علی امام نقوی

54/103، نوح اپارٹمنٹ، نیا نگر، میرا روڈ، تھانے۔ ۴۰۱۱۰۷ (ممبئی)

(Mob: 08879450630, 09769701770)

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	120.00
۲۔	یادبسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
۳۔	لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	40.00
۴۔	انتخاب افسانہ ۸۹ء (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	60.00
۵۔	برزخ (افسانے)	ہاجرہ شکور	40.00
۶۔	گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	50.00
۷۔	بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
۸۔	دل کی بات (افسانے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	60.00
۹۔	کاغذ کی دیوار (افسانے)	محافظ حیدر	60.00
۱۰۔	ادھار کی زندگی (افسانے)	مہر چند کوشک	60.00
۱۱۔	پیاسا سمندر (افسانے)	عقیلہ تبسم	60.00
۱۲۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۱۳۔	آخری داستان گو (ناول)	مظہر الزماں خاں	60.00
۱۴۔	دُختر ابلیس (افسانے)	محمد شبیر علی محمدوی	60.00
۱۵۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۱۶۔	روتا ہوا آدمی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	80.00
۱۷۔	کنیادان (ڈرامے)	وجے تنڈلکر (اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
۱۸۔	شہر چُپ ہے (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۱۹۔	بیان (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۲۰۔	منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانے)	احمد صغیر	60.00
۲۱۔	سنگ اُٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
۲۲۔	پوسٹر (افسانے)	قاسم خورشید	60.00
۲۳۔	جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۲۴۔	کن فیکون (افسانے)	رضوان احمد	90.00
۲۵۔	سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
۲۶۔	ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے)	انجم عثمانی	80.00

۲۷۔ بے ارادہ (افسانے)	رفیع حیدر انجم	80.00
۲۸۔ آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
۲۹۔ وینس کا پھول (افسانے)	سہیل اعجاز صدیقی	90.00
۳۰۔ موسم عذابوں کا (افسانے)	علی امام نقوی	80.00
۳۱۔ غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	120.00
۳۲۔ وہ دن (افسانے)	غیاث الرحمٰن	80.00
۳۳۔ جھلستے جنگل (ناول)	انور عظیم	100.00
۳۴۔ دس دن (ناول)	دُرواسا	90.00
۳۵۔ پرندے (افسانچے)	جوگندر پال	110.00
۳۶۔ آخر کب تک (ناول)	اقبال نظامی	120.00
۳۷۔ ذبح (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۳۸۔ لابوہیم (افسانے)	انور عظیم	150.00
۳۹۔ بساط (ناول)	علی امام نقوی	100.00
۴۰۔ مٹی کے حرم (ناول)	ساجدہ زیدی	250.00
۴۱۔ کارواں گزر گیا (افسانے)	ایم۔ ایچ۔ خان	150.00
۴۲۔ حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	250.00
۴۳۔ واپسی سے پہلے (افسانے)	صغیر رحمانی	150.00
۴۴۔ نادید (ناول)	جوگندر پال	150.00
۴۵۔ گمشدہ آدمی (افسانے)	یٰسین احمد	150.00
۴۶۔ غمِ دل وحشتِ دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	250.00
۴۷۔ بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے)	ساگر سرحدی	150.00
۴۸۔ مسیحا کی موت (افسانے)	قاضی انیس الحق	200.00
۴۹۔ شہر نگاراں (ناول)	رفعت سروش	200.00
۵۰۔ فساد (ناول)	مہر الدین خاں	100.00
۵۱۔ جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے)	جوگندر پال	180.00
۵۲۔ تپش (افسانے)	ولی محمد چودھری	150.00
۵۳۔ درد کا رشتہ (افسانے و ناولٹ)	راشد سہسوانی	200.00
۵۴۔ پرائی چیز (بچوں کی کہانیاں)	شکیل جاوید	120.00
۵۵۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)	انیس امروہوی	280.00

۵۶۔ صحرائی شب وروز (ناول)	سُنیل گنگوپادھیائے (مترجم: ٹوٹن مکھرجی، اے۔آر۔منظر)	120.00
۵۷۔ جاتے جاتے (طنز ومزاح)	یوسف ناظم	150.00
۵۸۔ راستہ بند ہے (ناول)	مصطفیٰ کریم	220.00
۵۹۔ چاہت کے رنگ (ناول)	طاہر تنویری	250.00
۶۰۔ قند مکرر (طنز ومزاح)	فیاض احمد فیضی	150.00
۶۱۔ سایہ اونچے پیڑ کا (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۶۲۔ رشتوں کی دیوار (افسانے)	اکرام الدین شبنم	140.00
۶۳۔ دہلیز سے اُترے پاؤں (افسانے)	شکیل جاوید	150.00
۶۴۔ ایک اور چکمہ (طنز ومزاح)	یوسف ناظم	160.00
۶۵۔ چار دیواری (ناول)	شوکت صدیقی	500.00
۶۶۔ جہانِ دگر (افسانے)	فیاض رفعت	300.00
۶۷۔ ڈوبتے سورج کی روشنی (افسانے)	رئیس امجمی امروہوی	150.00
۶۸۔ تتلیاں ڈھونڈنے والی (افسانوی مجموعہ)	زاہدہ حنا	250.00
۶۹۔ نشیب وفراز (ناول)	بنت فاطمہ نقویہ	250.00
۷۰۔ صاعقہ (ناول)	رضیہ بٹ	250.00
۷۱۔ پس پردہ (فلمی مضامین)	انیس امروہوی	200.00
۷۲۔ خواب در خواب (افسانے)	ڈاکٹر صبیحہ انور	160.00
۷۳۔ سمندر اجنبی ہے (افسانے)	کرامت غوری	200.00
۷۴۔ سکندر کا مقدر (ناول)	ڈاکٹر سلیم خان	250.00
۷۵۔ آخری فیصلہ (ڈراما: مہیش دتانی)	مترجمین: ڈاکٹر ٹوٹن مکھرجی، اے۔آر۔منظر	140.00
۷۶۔ شکستہ ستون پر دھوپ (ناول)	عطیہ حسین/ترجمہ: انتظار حسین	300.00
۷۷۔ مکھوٹوں کے درمیان (ڈرامے)	صادقہ نواب سحر	250.00
۷۸۔ فٹ پاتھ کی زبانی (ناول)	حبیب کیفی	150.00
۷۹۔ ملامتی (ناول)	حبیب کیفی	140.00
۹۰۔ بہشت زہرا (ناول)	ناصرہ شرما	360.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
54-C / 5, J - EXTENSION, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
PH. 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com

KAHI ANKAHI

(Short Stories)

ALI IMAM NAQVI

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
54 - C / 5, J-Extension., Laxmi Nagar, Delhi -110092
Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com